فہرست

لمعات

23مارچ	ادارہ	3
دروس القرآن (سورہ فاتحہ)	غلام احمد پرویز	7
خدا کا تصور	غلام باری، مانچسٹر	16
اِختلافِ قرأت کا افسانہ	جمیل احمد عدیل	19
خُمس کا مذہبی اور دینی مفہوم	خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی	44

ENGLISH SECTION

Basic Structure of An Economic System

By Maj Gen (Rtd) Ihsan-ul-Haq 1

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

23 مارچ

یوں تو ہر دن اللہ ہی کا ہوتا ہے لیکن بعض دنوں میں اس قسم کے عظیم الشان انقلاب واقع ہوتے ہیں کہ قرآن انہیں ''ایام اللہ'' کہہ کر پکارتا ہے۔ اسی طرح قوموں کی زندگی میں بعض دن ایسے آتے ہیں جن میں ان کا کاروان حیات ایک نیا موڑ مڑتا ہے اور اس سے ان کی قسمت کا پانسہ پلٹ جاتا ہے۔ اس قسم کے دن قوموں کی زندگی میں یادگار بن جاتے ہیں اور تاریخ کے اوراق میں درخشندہ حروف میں لکھے جاتے ہیں مسلمانانِ ہندو پاکستان کی حیات ملی میں گذشتہ پچیس سال کے عرصہ میں کئی دن ایسے آئے ہیں جن کی یاد کو تاریخ اپنی آغوش میں محفوظ رکھے گی۔ ان میں سب سے پہلا یادگار دن ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کا تھا جب الہٰ آباد کے مقام پر مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں، حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے اپنا وہ خطبۂ صدارت ارزانی فرمایا جس نے فی الحقیقت اس قوم کے مستقبل کے دھارے کا رخ بدل دیا۔ اس سے پہلے مسلمانانِ ہند ایک راہ گم کردہ قافلے کی طرح پریشان و سرگرداں، ادھر ادھر مارے مارے پھرتے تھے۔ ان کے پاؤں اٹھتے تھے لیکن نہ سراغ راہ ان کے سامنے تھا نہ نشان منزل۔ وہ ہر دور سے نظر آنے والے غبار کی طرف لپک کر بڑھتے تھے کہ شاید اس میں وہ ''شہ سوارِ اشہبِ دوراں'' ہو جو انہیں صحیح و سلامت منزل مقصود تک لے جائے لیکن اس کے بعد مایوس ہو کر بیٹھ جاتے تھے کہ وہ غبار، بگولے کے رقص سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا تھا۔ اس تشتت و انتشار اور یاس و حزن کے عالم میں اس حکیم الامت نے جسے قرآنی بصیرت نے دیدۂ انجم عطا فرمایا تھا، ان پراگندہ افرادِ کارواں کو پکارا اور نہایت حکمت و تدبر اور شفقت و محبت سے انہیں بتایا کہ ان کی منزل مقصود کیا ہے اور اس تک پہنچنے کا صحیح راستہ کونسا۔ انہوں نے سب سے پہلے اپنے مخاطبین سے کہا کہ

> آپ نے مسلم لیگ کے اس اجلاس کی صدارت کے لئے اس شخص کو منتخب کیا ہے جو اسلام کے مستقبل سے مایوس نہیں۔ اسے پورا پورا یقین ہے کہ اسلام میں وہ قوت موجود ہے جو انسان کو اس کی تنگ نظری سے نجات دلا سکتی ہے جسے جغرافیائی حدود نے پیدا کر دیا ہے۔ جس کا ایمان یہ ہے کہ ایک فرد یا مملکت کی زندگی میں مذہب کی قوت بے حد اہمیت رکھتی ہے۔ اور جو (اس حقیقت پر علیٰ وجہ البصیرت) یقین رکھتا ہے کہ اسلام اپنی تقدیر آپ ہے۔ اس لئے دنیا کا کوئی حادثہ اسے تباہ نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد انہوں نے فرمایا کہ یہ تمہاری غلط نگہی ہے جو تم نے سمجھ رکھا ہے کہ مسلمانوں کی قومیت وطن کی حدود سے متشکل ہوتی ہے۔

ان کی قومیت کا مدار اسلام پر ہے۔

جس نے جذبات اور وفاشعاریوں کے وہ بنیادی اصول عطا کئے ہیں جو رفتہ رفتہ پراگندہ افراد اور منتشر گروہوں میں یک جہتی اور یک نگہی پیدا کر کے انہیں آخرالامر ایک متعین قوم میں تبدیل کر دیتے ہیں۔

قومیت کی ان نئی بنیادوں کی وضاحت کے بعد، وہ مسلمانانِ ہند کے مستقبل کو سامنے لائے اور کہا کہ

میں چاہتا ہوں کہ پنجاب۔صوبہ سرحد۔سندھ اور بلوچستان کو ایک دوسرے میں مدغم کر کے ایک مملکت بنا لیا جائے۔

انہوں نے اپنی اس آواز کے اظہار تک ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ایمان وایقان کی ایک ایسی آواز کے ساتھ جو دل کی گہرائیوں سے ابھرا کرتی ہے، پورے حتم ویقین سے فرمایا کہ

حکومت برطانیہ کے دائرہ کے اندر رہ کر ہو یا آزادانہ طور پر۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ ہندوستان کے شمال مغربی علاقہ میں مسلمانوں کی ایک مستحکم اور متحدہ مملکت کا قیام ان کے لئے مقدر ہو چکا ہے۔

یہ تھا نشانِ منزل (یعنی ہندوستان کے شمال مغربی علاقہ میں مسلمانوں کی ایک متحدہ مملکت کا قیام) اور وہ تھا سراغِ راہ (یعنی وطنی، نسلی، لسانی نسبتوں سے بلند ہو کر، محض اسلام کی بنیادوں پر مسلم قومیت کی تشکیل) جو ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو اس پراگندہ فکر اور افسردہ خاطر قوم کے سامنے رکھا گیا۔ یہ دن، فی الحقیقت مسلمانانِ ہندوستان کی زندگی میں، ہمیشہ زندہ وتابندہ رہنے والا دن تھا۔

چونکہ ہر انقلابی آواز کی طرح یہ آواز بھی اپنے زمانے سے بہت آگے تھی اس لئے کسی نے اسے سنجیدگی سے درخور اعتنا نہ سمجھا۔ لیکن زمانے کے تقاضے قوم کو کشاں کشاں اسی طرف لئے جا رہے تھے۔ انہی تقاضوں نے ان میں قائداعظمؒ جیسی شخصیت کو ابھار دیا۔ انہوں نے سب سے پہلے، قومیت کے اس ''جدید'' تصور کے ماتحت، مسلمانانِ ہند کو ایک جداگانہ ملت کی حیثیت سے منظّم کیا اور اس کے بعد ان میں اس منزل کے شعور کو بیدار کیا جس کا نشان اقبال نے ۱۹۳۰ء میں دیا تھا۔ چنانچہ چند ہی سال کی کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس قوم نے ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو، اسی حکیم الامتؒ کے مرقد کے سرہانے کھڑے ہو کر اپنے اس عزم کا اعلان کیا کہ ہم ہندوستان میں اپنی جداگانہ مملکت کو قائم کر کے رہیں گے۔ یہ دن اس قوم کی کتابِ زندگی میں ستاروں کی روشنائی میں لکھے جانے کے قابل ہے۔

اس عزم کے بعد، اس منزل تک پہنچنے کے لئے مسلسل جدوجہد جاری رہی تا آنکہ انہیں نہ صرف شمال مغربی بلکہ اس کے ساتھ ہی شمال مشرقی ہند میں بھی ایسا خطۂ زمین مل گیا جس میں یہ اپنے تصورات کے مطابق اپنی آزاد مملکت قائم کر سکتے تھے۔ یہ انقلاب عظیم ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو واقع ہوا۔ یہ دن ان کی حیاتِ ملی میں ہزاروں مسرتوں اور لاکھوں شادمانیوں کا پیامبر تھا اور بلاشائبۂ تشکیک، قرطاسِ ارض پر سورج کی کرنوں سے مرصع کاری اور زرنگاری کا مستحق۔ اس طرح سترہ سال کے قلیل عرصہ میں (جو قوموں کی زندگی

میں پلک جھپکنے سے زیادہ کا عرصہ نہیں کہلا سکتا) ایک ''شاعر کا خواب'' خواب یوسف کی طرح' حقیقت ثابتہ بن کر سامنے آ گیا۔

لیکن جہاں ایک طرف' اس قوم کی قسمت کے ستارے یوں ایک ایک کر کے بیدار ہوتے جا رہے تھے' تاریکی کا ایک گوشہ بھی اس کے ساتھ چلا آ رہا تھا کہ اقبالؔ نے پاکستان کا تصور دیا لیکن قبل اس کے کہ یہ حقیقت منتظر' لباس مجاز میں سامنے آ جائے' وہ ہم سے رخصت ہو گیا۔ پھر جناحؔ نے وہ خطۂ ارض حاصل کر لیا جس میں اس جدید مملکت کو متشکل ہونا تھا لیکن قبل اس کے کہ اس کی بنیادیں اس نقشے کے مطابق استوار ہوں۔ وہ بھی ہمیں الوداع کہہ گیا۔ اب قوم کے برسر اقتدار طبقہ کی حالت ان رئیس زادوں کی سی ہو گئی جنہیں بیٹھے بٹھائے ایک ریاست ورثہ میں مل جائے۔ اور عوام کی حالت ان یتیموں کی سی جن کا کوئی والی وارث ہی نہ رہے۔ چنانچہ اس عرصہ میں' اوپر کے طبقے نے اس مفت میں ملی ہوئی ریاست کا جو کچھ حشر کیا اور نیچے کے طبقے کے ساتھ جو کچھ بیتی اس کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ

فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَلْيَبْكُوا كَثِيرًا جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ (۹/۸۲)۔

انہوں نے جو کچھ اپنے ہاتھوں سے کیا ہے' انہیں چاہئے کہ اسے دیکھ کر روئیں بہت زیادہ اور ہنسیں بہت کم۔

اقبال نے تخلیق پاکستان کی اہمیت یہ بتائی تھی کہ

> ہندوستان میں' بہ حیثیت ایک ثقافتی قوت کے' اسلام کی زندگی کا دارومدار اس پر ہے کہ اسے ایک خاص خطہ میں مرکوز کر دیا جائے۔

اس کے بعد انہوں نے کہا تھا کہ ''یہ خطۂ زمین بیرونی حملہ آوروں کی مدافعت کا ذریعہ بن جائے گا خواہ وہ حملے توپ وتفنگ کے ہوں اور خواہ نظریات وتصورات کے۔'' اس کے بعد انہوں نے کہا تھا کہ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ

> اس سے اسلام کو اس کا موقع مل سکے گا کہ وہ اپنے آپ کو ان اثرات سے پاک اور صاف کر لے جنہوں نے اسے عربی ملوکیت کے زمانے میں ملوث کر دیا تھا۔ یہ اپنی تعلیم' اپنی ثقافت اور اپنے قوانین کو ایک طرف حقیقی اسلام سے اور دوسری طرف دور حاضرہ کے تقاضوں سے قریب تر کر سکے گا۔

یہ تھے وہ فوائد جو اسلام کو اس صورت میں حاصل ہونا تھے جب شمال مغربی خطہ ایک واحد مملکت بن جاتا۔ اب جبکہ ہم نے شمال مغربی خطہ کو ایک مملکت بنا لیا ہے' ہمارے پیش نظر ان مقاصد کا حصول ہونا چاہئے۔ یعنی ہم اس خطۂ زمین میں ایسا معاشرہ قائم کریں جو حقیقی اسلام (یعنی قرآن) کے اصولوں پر متشکل ہو اور ان اصولوں کی روشنی میں ہم ایسے جزئی قوانین مرتب کریں جو دور حاضر کے تقاضوں کو کما حقہ' پورا کر سکیں۔ اسی سے اسلام ان غیر اسلامی عناصر سے منزہ ہو سکے گا جو ہمارے دور ملوکیت کی یادگار ہیں اور جنہیں ہم غلط فہمی سے ہزار برس سے (حقیقی اسلام سمجھ کر) سینے سے لگائے پھر رہے ہیں اور اسی سے ہمارا دین ایک زندہ قوت بن کر دنیا میں ہماری حفاظت اور

صیانت کا ذمہ دار بن جائے گا۔اس لئے کہ (اقبال کے الفاظ میں) تاریخ کے نازک ادوار میں' اسلام نے مسلمانوں کو بچایا ہے۔ مسلمانوں نے اسلام کو نہیں بچایا۔''

اقبالؔ نے اپنے مذکورۂ بالا خطبہ میں یہ بھی بتایا تھا کہ ہمارے زوال کی دو علتیں بالکل نمایاں ہیں۔ایک تو یہ کہ ہم میں صحیح ٹائپ کے لیڈر نہیں۔

> لیڈر سے میری مراد ایسے افراد ہیں جو اپنی خداداد بصیرت یا تجربہ کی بنا پر' اسلام کی روح اور اس کی غایت سے پوری طرح واقف ہوں اور دوسری طرف عصر حاضر کے تقاضوں کا بھی صحیح صحیح احساس رکھتے ہوں۔اس قسم کے افراد درحقیقت قوم کے لئے ''خدائی قوت'' کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ یہ خدا کی طرف سے بنے بنائے ملتے ہیں۔آرڈر دے کر بنوائے نہیں جاسکتے۔

دوسری علت انہوں نے یہ بتائی تھی کہ ہماری قوم میں ''ملی شعور'' کی کمی ہوتی جارہی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے ذاتی مفاد کے پیچھے پڑا رہتا ہے اور ملت کے تعمیری کاموں کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہمارے ہاں اس وقت کوئی لیڈر بھی ان خصوصیات کا حامل نہیں جس کی طرف اقبال نے اشارہ کیا ہے۔جو لوگ فضا میں خلا کی وجہ سے مذہبی پیشوائیت کی مسندوں پر متمکن ہوگئے ہیں اور زمامِ اقتدار اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں انہیں نہ اس کا علم ہے کہ اسلام کی روح اور غایت کیا ہے اور نہ ہی اس کا شعور کہ عصر حاضر کے تقاضے کیا۔لیکن اس کمی کو اس طرح پورا کیا جاسکتا ہے کہ ہم باہمی مشاورت سے اپنے تمام معاملات میں قرآن سے راہنمائی حاصل کریں اور اس کی روشنی میں عصر حاضر کے پیش کردہ مسائل کا حل تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ہوسکتا ہے کہ اس کوشش میں ہم کسی جگہ غلطی بھی کر جائیں۔لیکن غلطیوں سے کبھی گھبرانا نہیں چاہئے۔مزید تجربہ غلطیوں کی اصلاح خود بخود کر دیا کرتا ہے۔باقی رہی قوم میں ملی شعور کی بیداری' سو اس کی واحد صورت وہی ہے جسے قرآن نے بطور اصل الاصول پیش کیا ہے۔یعنی انفرادی مفاد کو کم از کم کر کے ملی مفاد کو زیادہ سے زیادہ کر دیا جائے۔بالفاظ دیگر' رزق کے سرچشموں کو انفرادی ملکیت سے نکال کر ملت کی اجتماعی تحویل میں دے دیا جائے تاکہ وہ انہیں تمام افرادِ ملت کی نشوونما کے کاموں میں صرف کر سکے۔قرآن نے اقوام کی تخلیق اور نشاۃ ثانیہ کا ایک اہم اصول بتایا ہے اور وہ یہ کہ پوری کی پوری قوم ایک فرد واحد کی حیثیت سے زندگی بسر کرے۔مَّا خَلْقُكُمْ وَلَا بَعْثُكُمْ إِلَّا كَنَفْسٍ وَاحِدَةٍ (۳۱/۲۸)۔اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ رزق کے سرچشموں میں افراد کا الگ الگ مفاد نہ رہے بلکہ پوری ملت کا مفاد مشترکہ ہو اور اس کے بعد کسی کے دل میں قطعاً یہ خیال نہ پیدا ہو کہ وہ سندھی ہے یا پنجابی۔بلوچی ہے یا سرحدی۔اگر اسلام لانے کے بعد بھی' امتیازاتِ رنگ و بو کے یہ بت ہمارے دلوں میں قائم رہے تو سمجھ لیجئے کہ ہمارے دلوں میں ایمان نے گھر نہیں کیا۔ہم بدستور مشرک کے مشرک ہیں۔

إِنَّا هَدَيْنَاهُ السَّبِيلَ إِمَّا شَاكِراً وَإِمَّا كَفُوراً (القرآن:۳/۷۶)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(نواں باب)

سورۃ الفاتحۃ

(آیت 7 اور خلاصہ)

عقل وفکر سے کام نہ لینے والوں کو قرآنِ کریم نے اصولی طور پر دو شقوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک وہ جو زندگی کے دوراہے پر پہنچ کر ' نہ یہ دیکھنے کی ضرورت محسوس کریں کہ انہیں کس راستہ کی طرف مڑنا چاہیے' نہ کسی سے ایسا پوچھنے کی حاجت ہو۔ جس راستہ پر ہجوم چلا جا رہا ہو' وہ بلا سوچے سمجھے انہی کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ اس کی سند ان کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ یہ وہ راستہ ہے جسے ہمارے اسلاف نے اختیار کیا ہے اور وہ ہم تک متواتر چلا آ رہا ہے۔ یعنی پچھلی بھیڑ سے پوچھیے کہ تم اس راستے پہ کیوں جا رہی ہو تو اس کا جواب یہ ہوتا ہے کہ اگلی بھیڑ جو اس راستے پر جا رہی ہے' میں اس کے پیچھے ہوں۔ ہمارے ہاں محاورے میں بھیڑ چال کہتے ہیں۔ بھیڑوں کو دیکھ کر تو ہم اس قدر متنفر ہوتے ہیں' کبھی نہیں سوچتے کہ پوری کی پوری قوم صدیوں سے بھیڑ چال پہ چلی ہوئی ہے۔ قرآنِ کریم ان کے متعلق کہتا ہے کہ جب وہ اس راستے پر چلتے چلتے جہنم میں جا پہنچیں گے اور ان سے پوچھا جائے گا کہ تم نے یہ راستہ کیوں اختیار کیا تھا تو وَ قَالُوْٓا رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا (33:67) وہ کہیں گے کہ اے ہمارے نشوونما دینے والے! ہمیں ہمارے ان بڑے بڑے بزرگوں' مذہبی راہنماؤں' اور لیڈروں نے گمراہ کیا اور ہمیں صحیح راستہ سے بھٹکا دیا۔ پہلی قسم تو ان کی ہے۔ دوسری قسم ان لوگوں کی ہوتی ہے جو صحیح راستہ کو جانتے تو ہیں لیکن ان کی مفاد پرستیاں انہیں اس راستہ پر آنے نہیں دیتیں۔ وہ اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر اندھے ہو جاتے ہیں اور ان کی عقل وفکر اور علم وبصیرت ان کے کسی کام نہیں آتی جیسے اچھا بھلا' دانا وبینا' عقل مند' ہوشیار ودانشور جب شراب کے نشے میں مخمور ہو جاتا ہے تو اس کی ساری کی ساری عقل وفکر مفقود ہو جاتی ہے۔ اس میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں تو ہوتی ہیں' سمجھ سوچ بھی سکتا ہے' جانتا بھی ہے لیکن نشے میں مغلوب ہو جاتا ہے۔ یہ جو نشہ ہے اسے قرآن نے جذبات کہہ کر پکارا ہے' وہ جذبات جو وحی کی رہنمائی میں کام نہیں کرتے بلکہ اس کے خلاف اپنی مفاد پرستی کے تابع چلتے ہیں' یعنی جذبات کے نشے میں مخمور ۔قرآن کہتا ہے کہ یہ بھی عقل وفکر کو کھو بیٹھتا ہے: اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ کیا تو نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا ہے' جس نے خود اپنے جذبات ہی کی پرستش اور محکومیت اختیار کر لی' اپنے جذبات کو اپنا الٰہ بنا لیا؟ یعنی اس کے تابع چلنے لگ گیا اپنے جذبات

سے مغلوب ہوگیا' اس طرح وَ اَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰی عِلْمٍ (45:23) خدا کے قانون کے مطابق' یہ شخص اس علم کے باوجود' جاننے بوجھنے کے باوجود صحیح راستہ کھو کر' غلط راستے پہ چل پڑا' اس کے اندر صحیح اور غلط کا امتیاز باقی نہ رہا وَّ خَتَمَ عَلٰی سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشٰوَةً (45:23) اور جیسا کہ نشے میں مدہوش انسان سے ہوتا ہے' نہ اس کی آنکھ صحیح دیکھتی ہے' نہ کان صحیح بات سنتا ہے' نہ دماغ صحیح سوچتا ہے' ان تمام پہ مہریں لگی ہوئی ہوتی ہیں۔ کہا کہ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ (45:23) جو اس طرح عقل و فکر کھو بیٹھے' کہیے کہ خدا کے قانون کے علی الرغم وہ کون ہے جو انہیں صحیح راستہ دکھا سکے؟ انسان کے پاس سب سے بڑی قوت عقل ہی کی ہے لیکن جب اس پر جذبات غالب آ جاتے ہیں تو عقل خود ان جذبات کی لونڈی بن جاتی ہے اور ان کے بروئے کار آنے کے لیے سامان و ذرائع بہم پہنچاتی' ان کے جواز کے لیے فریب آمیز دلیلیں وضع کرتی ہے۔ ان حالات میں کوئی ایسی قوت ہی اس کی راہ نمائی کر سکتی ہے جو عقل اور اس کے سطحی جذبات سے بلند ہو اور یہ قوت' وحی خداوندی کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ اس لیے کہا کہ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ (45:23) کیا لوگ اس بات کو سوچتے نہیں کہ ضلالت کا یہ پہلو کتنا خطرناک ہوتا ہے۔ ایک وہ ہیں' جو جانتے نہیں ہیں' بھیڑ چال کی طرح چلے جاتے ہیں۔ ایک یہ ہیں جو جانتے بوجھتے ہوئے' اپنی عقل کھو دیتے ہیں کیونکہ جذبات پرستی کے تابع وہ مدہوشی کے عالم میں ہوتے ہیں' جو چلے جا رہے ہوتے ہیں۔ انہیں کون صحیح راستے پہ لا سکتا ہے؟

میں پھر دہرا دوں۔ یہ بات پہلے بھی آ چکی ہے کہ انسانی جذبات ایسے نہیں ہیں جو قابل نفرت ہوں اور یہ کہ قرآن نے ان کی بڑی مذمت کی ہے۔ نہیں' قطعاً نہیں۔ جذبات تو بڑی قوت ہیں۔ انسان کے اندر قوتِ عمل تو جذبات ہی ہوتے ہیں۔ یہ انسان کے عمل کے محرک ہوتے ہیں۔ جو جذبات' خدا کی اقدار سے سرکش ہو کر' سیلاب کی شکل اختیار کر لیں' اور انسان کی عقل و فکر پر غالب آ جائیں' تو یہ وہ جذبات ہیں جو قابلِ نفرت ہیں ورنہ جو دوسرے جذبات ہیں' ان کے لیے یہ نہیں کہا۔ وحی خداوندی سے سرکش جذبات ان کے متعلق قرآن نے کہا کہ وَ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ [1] (28:50)۔ یہ لوگ جن میں علم و عقل رکھنے کے باوجود صحیح راستے کی' صحیح اور غلط کی' تمیز اٹھ جاتی ہے' وہ کنفیوز ہوئے پھرتے ہیں' یہ وہ لوگ ہیں' جو وحی کی روشنی کے بغیر اپنے جذبات سے کام لیتے ہیں۔ دیکھا! اب قرآنِ کریم نے کس طرح دونوں میں تمیز کر کے رکھ دی۔

انسانیت کے لیے موجودہ جمہوریت کا تصور ایک خطرناک مرض ہے

اب آگے چلیے۔ ہمارے زمانے میں گمراہی کی ایک اور شکل بھی ہے جو اس وقت ساری دنیا میں عام ہو رہی ہے اور اسے

---

[1] جو شخص' خدا کی رہنمائی کو چھوڑ کر اپنے جذبات کے پیچھے لگ جاتا ہے' اس سے زیادہ راہ گم کردہ اور کون ہو سکتا ہے؟ (مفہوم القرآن از پرویزؒ ص 896)

عصرِ حاضر کا بہت بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ وہ روش ہے جسے ڈیموکریسی یا جمہوریت کہہ کر پکارا جاتا ہے اور جس کی بنیاد اس نظریے پر ہے کہ جو بات اکیاون فیصد کہہ دیں وہ صحیح ہوتی ہے۔ آپ سوچیے کہ یہ معیار کیا ہے یعنی اگر اس پارٹی کے دو ووٹ کم ہو گئے' یہ انچاس میں رہ گئی' تو یہ کتنی ہی صحیح بات کیوں نہ کہے یہ غلط ہے اور اگر کسی طرح انہوں نے دو ووٹ اپنے ساتھ ملا لیے تو کتنی ہی غلط بات کیوں نہ کہے وہ صحیح ہے۔ قرآنِ کریم کہتا ہے کہ یہ تو صحیح اور غلط کا کوئی معیار نہیں ہے۔ یہ تو گمراہی کی بدترین شکل ہے۔ مثلاً 1961ء کے فیصلے کو قانون صحیح قرار دیتا ہے' قوم صحیح قرار دیتی ہے۔ اسے دنیا کہتی ہے کہ ڈیموکریسی کے تحت فیصلہ ہو رہا ہے تب جمہوریت کے نظام کے تابع یہ فیصلہ ہو رہا ہے' کوئی اس کو چیلنج نہیں کرتا' کوئی اس کو برا نہیں سمجھتا۔ کہا کہ سوچیے تو سہی' جو اکیاون فی صد کا فیصلہ لے کر اس راستے پر چلیں' محض اس سند کے ساتھ کہ 51 فی صد نے اس کے حق میں ووٹ دیا ہے' اس قسم کے گمراہ کو' راستہ کھو دینے والے کو' صحیح راستے پہ کون لائے گا؟ کہا کہ وَ اِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِی الْاَرْضِ یُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا یَخْرُصُوْنَ (6:116) اگر تو انسانوں کی اکثریت کا اتباع کرے گا تو وہ تجھے خدا کی طرف لے جانے والے راستے سے گمراہ کر دیں گے۔ یہ لوگ ظن و تخمین کا اتباع کرتے ہیں اور قیاسات پر چلتے رہتے ہیں۔ حق کا کوئی خارجی معیار ان کے پاس نہیں ہوتا۔ ان کے برعکس اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ یَّضِلُّ عَنْ سَبِیْلِهٖ ۚ وَ هُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ (6:117) غلط اور صحیح' حق اور باطل' کا معیار صرف خدا کی رہنمائی ہے۔ یہی وہ راہنمائی ہے جس کے متعلق نوعِ انسان سے کہا گیا تھا کہ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَایَ فَلَا یَضِلُّ وَ لَا یَشْقٰی (20:123) جو میری راہنمائی کا اتباع کرے گا تو نہ وہ صحیح راستہ سے بھٹکے گا اور نہ ہی جگر پاش مشقتوں میں مبتلا ہو کر سعادتوں سے محروم رہ جائے گا۔

مذہبی پیشوائیت دین اللہ کے اندر خودساختہ مذہب کو ملا کر فروخت کرتی ہے

عزیزانِ من! میں نے شروع میں بتایا تھا کہ جو ضلال یا ضلالت کا مادہ ہے' اس کے ایک معنی یہ بھی ہوتے ہیں کہ دو چیزوں کا اس طرح آپس میں مل جانا کہ انہیں الگ الگ کرنا ممکن نہ رہے' جس طرح دودھ میں پانی مل جاتا ہے تو وہ نظر دودھ ہی آتا ہے' پانی اس کے اندر گم ہو جاتا ہے اور اس کے بعد آپ دودھ اور پانی کو الگ نہیں کر سکتے' اسے دودھ ہی کہا جاتا ہے۔ یہ ضلالت کون سی ہے؟ جیسا کہ میں پہلے درسوں میں بتا چکا ہوں جب حضرات انبیائے کرامؑ کا پہنچایا ہوا دین خداوندی مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو اس میں تلبیس حق و باطل کی یہی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ ایک دوسرے میں اس طرح مدغم ہو جاتے ہیں کہ ان کا الگ الگ کرنا تو ایک طرف' ان کی شناخت بھی مشکل ہو جاتی ہے۔ پھر جس طرح ایک گوالا پانی ملے ہوئے دودھ کو خالص دودھ کہہ کر بیچتا ہے' مذہبی کاروبار کرنے والے مذہبی' خودساختہ متاعِ کاشت کو' دین کا زرِ خالص بتا کر بیچتے ہیں اور اس کی بڑی بڑی قیمتیں وصول کرتے ہیں۔ یہی ہیں جن کے متعلق کہا

گیا کہ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْتَرِیْ لَھْوَ الْحَدِیْثِ لِیُضِلَّ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِغَیْرِ عِلْمٍ ۖ وَّ یَتَّخِذَھَا ھُزُوًا ط اُولٰئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ مُّھِیْنٌ (31:6) یہ لوگ اپنے وضع کردہ افسانوں اور خواب آور داستانوں سے لوگوں کو مبتلائے فریب رکھتے ہیں تاکہ انہیں خدا کے راستے سے گمراہ کیے رکھیں۔ یہ ہوتے تو ہیں جاہل لیکن اپنے آپ کو بہت بڑے عالم کہہ کر لوگوں کے مقتدا [1] بن جاتے ہیں۔ وہ یہ سب کچھ روٹی کی خاطر کرتے ہیں' اور اس خودساختہ مذہب کو دین کا لباس اوڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ وہ بڑا مضحکہ انگیز ہوتا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دنیا اسے ہی حقیقی دین سمجھ لیتی ہے۔ چونکہ دنیا اسے دین خداوندی سمجھتی ہے' اس لیجئے روش حقیقی دین کے متعلق ہوتی ہے' دنیا وہی روش اس خودساختہ مذہب کے متعلق اختیار کر لیتی ہے۔ کہا کہ جو قوم دین کے ساتھ اس قسم کا کھیل کھیلے' وہ بڑے ہی ذلت آمیز عذاب میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ آپ اقوامِ عالم پر چھلتیہوئی نگاہ ڈالیے۔ آپ دیکھیں گے کہ جس قدر کوئی قوم مذہب میں ڈوبی ہوئی ہوگی' اسی قدر جاہل اور پسماندہ ہوگی۔ یہی خدا کا عذاب ہے۔ مذہب تو اہم پرستیوں کا مجموعہ ہوتا ہے اور توہم پرستی کا لازمی نتیجہ نکبت و افلاس ہوتا ہے۔ یہ ضلالت کی پست ترین اور بدترین شکل ہوتی ہے۔

مذہب کے اندر امیری اور غریبی خدا کے ہاتھ ہوتی ہے

ہم نے' عزیزانِ من! غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ (1:7) کے درس کے سلسلے میں آخری نکتہ یہ پیش کیا تھا کہ جو قوم رزق کی غیر متوازن تقسیم کرتی ہے' اس پر خدا کا غضب نازل ہوتا ہے اور وہ اسے خوف اور بھوک کے عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔ آپ دیکھیے کہ قرآنِ کریم نے اسی معاشی نکتے کو لیا کیونکہ اس میں ضلالت کا پہلو آتا ہے۔ معاشی گوشے میں ضلالت کا پہلو ہے' غضب کا پہلو ہے۔ یہاں ضلالت کا ایک اور پہلو آتا ہے۔ آپ کسی سے بھی وعظ سنیئے' ناصح سے نصیحت سنیئے' جس شخص سے بھی یہ بات کیجیئے' کسی سرمایہ دار سے ہی گفتگو کیجیئے' وہ نہایت مقدس الفاظ میں یہ کہے گا کہ بابا! رزق کی تقسیم خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہوئی ہے' وہ جسے چاہے امیر بنا دے، جسے چاہے غریب کر دے' اس میں کسی انسان کا کوئی دخل ہی نہیں ہے۔ یہ کوشش کرنا بھی کہ کوئی غریب امیر ہو جائے گویا خدا کو چیلنج کرنا ہے' وہ اسے غریب رکھنا چاہتا ہے' تم اس کے علی الرغم کہتے ہو کہ نہیں' ہم اسے دولت مند بنا دینا چاہتے ہیں۔ معاذ اللہ وہ کہتے ہیں کہ یہ خدا کے خلاف اتنا بڑا چیلنج ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ آپ اسی نقشے کو دیکھیے کہ لوگوں کو گمراہی میں رکھنے والے کیا تکنیک اختیار کرتے ہیں۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰہُ (36:47) جن لوگوں کے پاس ضرورت سے زیادہ رزق ہوتا ہے' جب ان سے کہا جاتا ہے کہ تم اس فاضلہ رزق کو ان لوگوں کے لیے کھلا رکھو' جنہیں اس کی احتیاج ہے تو وہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ تم

---

[1] وہ شخص جس کی لوگ پیروی کریں' پیشوا' رہنما۔

ہمیں کس قدر غلط راستہ اختیار کرنے کی تلقین کر رہے ہو۔ **قال الذین کفروا للذین امنوا انطعم من لو یشاء الله اطعمه** (36:47) تو یہ لوگ اس قسم کی نصیحت کرنے والوں سے' اس قسم کا مطالبہ یا تقاضا کرنے والوں سے' کہتے ہیں کہ تم کیا کہہ رہے ہو' کیا تم چاہتے ہو کہ ہم ان کی روٹی کا انتظام کریں' جنہیں خدا بھوکا رکھنا چاہتا ہے' انہیں امیر بنانے کی کوشش کریں' جنہیں خدا غریب رکھنا چاہتا ہے' تم ہمیں خدا سے لڑانا چاہتے ہو، اس کے خلاف آمادۂ جنگ کرنا چاہتے ہو۔

رزق کی تقسیم کا فریضہ اسلامی مملکت کے ذمہ ہوتا ہے

خدا کی طرف سے ان کے اس اعتراف کا جواب یہ ملتا ہے کہ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (36:47) ان سے کہو کہ تم اس قدر کھلی ہوئی گمراہی یا فریب دہی میں مبتلا ہو۔ خدا کسی کو یوں رزق نہیں دیا کرتا۔ یہ رزق کی تقسیم اسلامی نظام کے ہاتھوں سے ہوتی ہے اور وہ نظام جس میں اس قسم کی طبقاتی تفریق نہیں رہتی' خدا کی رہنمائی کے مطابق متشکل ہوتا ہے۔ یہ ''منعم علیہ'' لوگوں کی راہ ہے۔ اور یہ جو تم کہتے ہو' یہ تم اپنی مفاد پرستانہ سرمایہ داری کا تحفظ کرتے ہو اور اس کو خدا کی مرضی کے اس مقدس نقاب میں چھپاتے ہو۔ آپ نے دیکھا کہ کس طرح یہ دودھ اور پانی ایک دوسرے کے ساتھ مل گیا ہے۔ نظر بہ ظاہر یہ دلیل بڑی ہی قوی اور بڑی ہی مقدس نظر آتی ہے کہ خدا کی مشیت یہ ہے' کہ یہ لوگ اس حالت میں رہیں' خدا انہیں اس حالت میں نہ رکھنا چاہتا تو دنیا کی کون سی طاقت تھی جو انہیں مجبور کر کے اس حالت میں رکھ سکتی تھی۔ خدا کے حکم کے بغیر تو پتہ بھی نہیں ہل سکتا لہٰذا جس حالت میں جو جہاں ہیں وہ سب خدا کی مشیت کے مطابق ہے۔ آپ نے دیکھا' عزیزانِ من! یہ جو دودھ میں ملا ہوا پانی ہے یہ کس قسم کی ضلالت ہے۔ بہرحال ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآنِ کریم نے جب جماعت مومنین کو یہ دعا سکھائی تھی کہ ہم ان لوگوں کے راستے پر نہ چلیں جو ''ضالین'' ہیں تو اس سے کیا مقصود تھا۔ اسی بنا پر اس نے تاکید کی کہ وَ لَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّ ضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ (5:77) تم ان لوگوں کے جذبات کا اتباع مت کرنا جو اس سے پہلے خود بھی گمراہ ہو گئے اور انہوں نے دوسروں کو بھی گمراہ کیا اور اس طرح یہ تابع اور متبوع' خود چلنے والے اور ان کے پیچھے جانے والے' دونوں خدا کی طرف لے جانے والے سیدھے اور متوازن راستہ سے بھٹک گئے۔

''مغضوب علیه'' اور ''ضالین'' کوئی خاص قوم نہیں ہوتی

آخر میں' میں ایک چیز اور بھی واضح کرنا چاہتا ہوں۔ آپ قرآنِ کریم کے ترجمے یا تفسیر میں دیکھیں گے کہ وہاں لکھا ہوا ہوتا ہے کہ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّيْنَ (1:7) میں **مغضوب علیهم** سے مراد یہودی ہیں اور ''ضالین'' سے مراد عیسائی

ہیں۔یعنی ان سے مراد ہم نہیں ہیں۔اپنے متعلق تو ہم خودفریبی میں مبتلا ہیں کہ ہم ''منعم علیہ'' ہیں تو غیر المغضوب علیہم میں' مغضوب علیہ یہودی ہیں ضالین عیسائی ہیں۔عزیزانِ من! ''مغضوب علیہ اور ضالین'' سے کوئی خاص قوم مراد نہیں ہے۔اس کا اطلاق تو ان تمام قوموں پر ہوگا جو غلط راستوں پر چلنے کی وجہ سے نعمائے خداوندی سے محروم ہوں گی اور اس طرح تباہی اور بربادی کے جہنم میں جا گریں گی' خواہ وہ زمانۂ نزولِ قرآن سے پہلے کی قومیں تھیں' خواہ خود اس زمانے کی قومیں ہوں' اور خواہ قیامت تک آنے والی قومیں ہوں۔اور پھر آگے یہ بات کہ خواہ اس قوم نے اپنا نام کچھ بھی کیوں نہ رکھ دیا ہو' بات تو ان خصوصیات کی ہے' جو قرآن نے بیان کی ہیں۔جس قوم میں وہ خصوصیات ہوں گی' وہ مغضوب علیہ ہوگی' اس کا شمار ضالین کے زمرے میں ہوگا۔یہی نہیں کہ ہم مغضوب علیہ یہودیوں کو کہتے ہیں اور ضالین عیسائیوں کو اور سمجھتے ہیں کہ ہمارا شمار ان میں نہیں ہوتا۔

آج ہم مسلمانوں نے قرآن حکیم کی منزہ اور مشہود تعلیم کو مختلف فرقوں میں بانٹ رکھا ہے

ہم نے تو پورے کے پورے قرآن کو اسی طرح مختلف فرقوں میں بانٹ رکھا ہے۔جہاں جہاں تباہیوں اور بربادیوں کا ذکر آتا ہے' ہم یہ کہہ کر خودفریبی میں مبتلا ہوجاتے اور مبتلا رہتے ہیں کہ یہ یہود کے متعلق تھا' یہ نصاریٰ کے متعلق تھا' یہ مشرکین مکہ کے متعلق تھا' یہ کفارِ عرب وغیرہ کے متعلق ہے۔یہ سب جہنمی ہیں اور جنت صرف ہمارے لیے تیار کی گئی ہے لیکن خودفریبی سے حقیقتیں تو بدل نہیں جایا کرتیں۔ہم اس خودفریبی سے اسی صورت میں نکل سکتے ہیں کہ ہم خدا کی کتاب کو معیار قرار دے کر یہ دیکھیں' سمجھیں اور پرکھیں کہ ہمارا شمار منعم علیہ کے زمرے میں ہوتا ہے یا مغضوب علیہ اور ضالین کے گروہ میں۔اس معیار پر اپنے آپ کو' اپنی قوم کو' پرکھنے سے جو نتیجہ سامنے آتا ہے' اس سے تو روح میں کپکپی پیدا ہوجاتی ہے۔عزیزانِ من! یہاں پر سورۃ الفاتحۃ کی آخری آیت کا درس اب ختم ہوتا ہے۔

خلاصہ سورۃ الفاتحۃ

عزیزانِ من! میں چاہتا ہوں' کچھ تھوڑا سا وقت بھی ہمارے پاس ہے' کہ میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور اس سورۃ الفاتحۃ کی ساتوں آیات کا خلاصہ آپ کے سامنے پیش کر دوں۔آپ نے دیکھا ہوگا کہ ہر کتاب کے شروع میں مقدمہ یا پیش لفظ لکھ دیا جاتا ہے۔اس سے اس کتاب کے موضوع یا مندرجات کا تعارف کرانا مقصود ہوتا ہے۔موزوں ترین مقدمہ یا پیش لفظ اسے سمجھا جاتا ہے جو نہایت مختصر لیکن جامع الفاظ میں اس حقیقت کو سامنے لے آئے' جو اس کتاب کا مقصود و مطلوب ہے۔سورۃ الفاتحۃ کو فاتحۃ الکتاب کہا جاتا ہے' جس کے معنی یہ ہیں کہ یہ سورۃ الکتاب یعنی قرآن کریم کا یوں سمجھیے گویا پیش لفظ یا تعارف ہے۔ اسے دیکھیے تو یہ سات آیات پر مشتمل

سورت ہے اور آیات بھی ایسی مختصر کہ دو دو چار چار الفاظ پر مشتمل ہیں۔ لیکن ان کی جامعیت کا یہ عالم ہے کہ قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم اور دین کے نظام کا ملخص اس کے اندر یوں سمٹ کر آ گیا ہے جیسے آنکھ کے تل میں آسمان۔ یہ قرآنِ کریم کے ایجاز اور اعجاز کی نمایاں شہادت ہے۔

سورۃ الفاتحۃ کے شروع میں ''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم'' کے الفاظ سامنے آتے ہیں۔ اگر انہیں خدا کی طرف منسوب کیا جائے یعنی اس میں متکلم خود خدائے تعالیٰ سمجھا جائے تو اس کا مفہوم یہ ہوگا کہ ''اس کتاب کو اس لیے نازل کیا گیا ہے کہ نوعِ انسان کی نشوونما کی جو ذمے داری خدا نے اپنے اوپر لے رکھی تھی' وہ پوری ہو جائے (6:12;6:54)۔ یہ نشوونما وحی کی راہنمائی کے بغیر ممکن نہیں۔ (10:57;58;17;82)''۔ اور اگر اسے انسانوں کی طرف منسوب کیا جائے یعنی یہ سمجھا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو یہ تعلیم دی ہے اور کہا ہے کہ تم ایسا کرو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ''ہر عبد مومن اس کا اعتراف اور اعلان کرتا ہے کہ میں جس پروگرام کو ہاتھ میں لے رہا ہوں' اس سے مقصد یہ ہے کہ خدا کی صفتِ رحمانیت اور رحیمیت کی نمود عام ہو جائے''۔

اس کے بعد سورۃ الفاتحۃ ہمارے سامنے آتی ہے۔ میں اس کے ملخص کے لیے مناسب الفاظ اور بیان کی فکر میں تھا کہ میں نے دیکھا کہ اس کا جو مطلب میں نے ''مفہوم القرآن'' میں بیان کر دیا ہے وہ اس کا موزوں ترین خلاصہ ہے۔ اس لیے میں اسی کو یہاں پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں اور وہ یہ ہے:

آیات 1 اور 2

''جب انسان اس کارگہہِ کائنات کے نظم ونسق پر غور کرتا ہے تو اس کے سامنے یہ حقیقت بے نقاب ہو کر آ جاتی ہے کہ اس میں' ہر شے کو وہ سامانِ نشوونما کس طرح بلا مزد و معاوضہ ملتا چلا جاتا ہے' جس سے وہ اپنے نکتہ آغاز سے مقامِ تکمیل تک پہنچ جاتی ہے۔ عام حالات میں تدریجاً اور عند الضرورت ہنگامی عملِ ارتقا Emergent Evolution (فجائی ارتقا) کے ذریعے۔ اس حیرت انگیز نظامِ ربوبیت کو دیکھ کر' ہر صاحب بصیرت کی زبان پر بے اختیار کلمات تحسین و آفرین آ جاتے ہیں' اور وہ بلا ساختہ پکار اٹھتا ہے کہ: اے ہمارے نشوونما دینے والے! تو نے اس کائنات کی کسی شے کو نہ بے کار پیدا کیا اور نہ ہی تخریبی نتائج کے لیے (3:189-190)۔ یہی وہ اربابِ علم وایقان ہیں جو صحیح معنوں میں خدا کی حمد کرنے والے ہیں (9:112;35:27-28)''۔

یہ ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (1:1) الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ (1:2)۔ اور آگے یہ ہے کہ ''خدا کے اس پروگرام کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ جو مستبد قوتیں دوسروں کی نشوونما کی راہ میں حائل ہوں' انہیں راستے سے ہٹا دیا جائے۔ یہ حمدیت کا قدم اول ہے (6:45)۔

آیت3

''ان مستبد قوتوں کو راستے سے ہٹانے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک ایسا نظام قائم ہوجائے گا جس میں نہ کوئی انسان' دوسرے انسان کا محتاج ہوگا نہ محکوم۔اس میں تمام امور کے فیصلے خدا کے قوانین کے مطابق ہوں گے(7:11:43:84:82:18:19)۔یہی وہ نظام ہے جسے آخرالامر' انسانوں کے تمام خودساختہ نظام ہائے حیات پر غالب آ کر رہنا ہے۔(9:33)۔

آیت4

''یہ نظام ان افراد کے ہاتھوں متشکل ہوگا جو اس حقیقتِ کبریٰ کا اعلان اور عملاً اس اعلان کی تصدیق کریں گے کہ ہم خدا کے سوا کسی کی اطاعت اور محکومیت اختیار نہیں کرتے اور نہ ہی کسی غیر خدائی نظام سے خواست گارِ معاونت ہوتے ہیں (3:78;12:40)۔اس کا عملی طریق اس کتابِ عظیم (قرآن مجید) کے احکام واصول کی اطاعت ہے(15:44-48)اور یہی خدا کی عبدیت اور عبادت ہے۔

آیت5

''یہ افراد (جماعت مومنین) جب سفر حیات کے لیے قدم اٹھاتے ہیں' تو یہ حسین تمنائیں اور مقدس آرزوئیں دعا بن کر ان کے لبوں تک آجاتی ہیں کہ: بارِالہا! زندگی کا وہ سیدھا اور ہموار ومتوازن راستہ اُبھر اور نکھر کر ہمارے سامنے آجائے جو ہمیں' بلاخوف وخطر ہماری منزلِ مقصود تک لے جائے۔

آیت6

''یعنی وہ راستہ جس پر چل کر' سعادت مندامم سابقہ' زندگی کی خوشگواریوں اور سرفرازیوں سے بہرہ یاب ہوئیں۔اس سے انہوں نے' کائنات کی قوتوں کو مسخر کر کے' اپنی ہم عصر اقوام میں امتیازی حیثیت حاصل کرلی(2:47;81:20)۔

آیت7

''جب تک یہ قومیں' تیرے متعین کردہ راستے پر چلتی رہیں' زندگی کی شادابیوں سے بہرہ یاب رہیں' جب ان کے نظریہ حیات میں تبدیلی آگئی تو یہ نعمتیں ان سے چھن گئیں اور دنیا میں ذلیل وخوار ہوگئیں(2:61;7:152)۔ان کی سعی وعمل کی کھیتیاں جھلس کر راکھ کا ڈھیر بن گئیں۔اور چونکہ صحیح راستہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا' اس لیے ان کا کاروانِ حیات اپنی قیاس آرائیوں کے پیچ وخم میں کھو کر رہ گیا۔وہ کبھی آنکھیں بند کر کے' اپنے آباؤاجداد کی فرسودہ راہوں پر چلتے رہے(37:69:71)اور کبھی انہوں نے خود اپنے

جذبات ہی کو اپنا راہنما بنا لیا (45:23)۔ جب اس سفر بے منزل کی بھول بھلیوں میں کھو کر مایوس ہو گئے تو یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے لیا کہ خدا کو منظور ہی نہ تھا کہ ہمیں سیدھا راستہ دکھاتا (6:149)۔ ''بارِ الہا! ہم تجھ سے تیرے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کی توفیق طلب کرتے ہیں تا کہ ہمارا حشر بھی ان سوختہ سامانوں کا سا نہ ہو جائے' کہ ہم جانتے ہیں کہ جو قوم تیری راہنمائی سے منہ موڑ لے' اسے کوئی صحیح راستہ نہیں دکھا سکتا (61:5)۔ اس کے ساتھ ہی ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ راستہ انہی کے سامنے آ سکتا ہے جو اس کی تلاش کے لیے جدوجہد کریں (29:69)۔ ہم تجھ سے اس جدوجہد کی بھی توفیق طلب کرتے ہیں۔''

یہ ہے برادرانِ عزیز! ''مفہوم القرآن'' میں دیئے ہوئے سورۃ الفاتحۃ کا خلاصہ تھا جو میں نے آپ کے سامنے پیش کیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ آج اٹھائیس اکتوبر 1979 کو میں سورۃ الفاتحۃ کے ان متعارفی دروس کے 9 درسوں سے بحمدہٖ تعالیٰ فارغ ہوا ہوں اور انہیں ٹیپس میں محفوظ کر دیا ہے تا کہ آپ سامعین کے لیے بھی یہ فائدے کا موجب ہو اور اس کے بعد آنے والی نسلیں بھی اس محفوظ سرمایہ سے استفادہ کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ میری اس سعی کو مشکور فرمائے اور آپ کی قرآن کے ساتھ وابستگی کے جذبے میں برکت عطا فرمائے۔ والسلام علیکم

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀......❀❀......❀

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(غلام باری، مانچسٹر)

خدا کا تصور

خدا فارسی زبان کا لفظ ہے اور یہ صرف ایران، افغانستان اور پاکستان سے تعلق رکھنے والے مسلمانوں کے ہاں اللہ کے لئے بولا جاتا ہے۔ یہ ایک حیران کن، تاسف انگیز اور دلخراش حقیقت ہے کہ جہاں تک اللہ کو پکارنے کا تعلق ہے سکھ قوم ہم سے بہتر ہے۔ ہم تو بالکل گئے گزرے ہیں کیونکہ ہم نے اللہ کا نام (Nick Name) خدا رکھ چھوڑا ہے۔ معاذ اللہ۔ اور سکھ حضرات اللہ کو اس کی قرآنی صفت ''رب'' سے پکارتے ہیں۔ ال + الہٰ = اللہ کا مطلب ہے صاحبِ اقتدار۔ الحاکم The only Sovereign اور رب کے معنی ہیں رزق فراہم کرنے والا۔ نشوونما دینے والا۔ اس کے برعکس لفظ خدا ہیچ معنی نہ دارد، عرب اس لفظ سے ناواقف ہیں۔ وہ اللہ بولتے ہیں۔

اللہ کی ذات کے متعلق ہم کچھ نہیں جان سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے اللہ کی معرفت (اس کی ذات کو جاننے پہچاننے) کا حکم نہیں دیا۔ اس پر ایمان لانے کا مطالبہ کیا ہے اور اس کی صفات بتائی ہیں۔ اللہ پر صحیح ایمان کے معنی ہیں ایسی ذات کا ماننا جس کی وہ صفات ہیں۔ لیکن ایمان صرف یہی نہیں کہ There is God، خدا ہے۔ ساری کائنات تو ایک طرف ہمارا اپنا وجود اس کی زندہ شہادت ہے کہ ہمیں پیدا کرنے والی کوئی ہستی ہے۔ اس لئے اللہ پر ایمان کے معنی اس کی ہستی پر ہی یقین نہیں بلکہ اس کی ہر بات پر اعتماد، اس کے قوانین پر پورا پورا بھروسہ و اعتماد اور اس کی اطاعت کا اقرار کرنا ہے۔ انسانی ذہن خدا کے متعلق جو تصور قائم کرتا ہے اس کی ذات اس سے بلند و بالا ہے۔ محدود ذہن لامحدود کا تصور کر ہی نہیں سکتا۔ سُبۡحَانَ اللّٰہِ عَمَّا یَصِفُون (۲۳/۹۱)۔ سے یہی مراد ہے۔

خدا سے ہمارا تعلق اس کی کتاب (قرآن کریم) کے ذریعے ہے۔ اس کے علاوہ اس کے ساتھ ہمارے تعلق کی کوئی صورت نہیں۔ اس کی اطاعت سے مفہوم بھی یہی ہے کہ قرآن کریم کے قوانین و احکام کی اطاعت کی جائے۔ اس کو پکارنے کے معنی بھی یہی ہیں کہ زندگی کے ہر دوراہے پر اس کی دی ہوئی راہنمائی (قرآن کریم) سے دریافت کیا جائے کہ ہم کس راستے کو اختیار کریں۔

قرآن کریم کی تعلیم میں بنیادی نقطہ خدا کے تصور

کا ہے۔ خدا کے جس تصور کو قرآن پیش کرتا ہے ہو نہیں سکتا کہ انسان اس پر عقل وفکر سے غور کرے اور اسے ماننے سے انکار کردے اور وہ تصور یہ ہے کہ **قل ھو اللہ احد**۔ اے رسول! ان سے کہو خدائے واحد اپنی ذات وصفات میں یگانہ ہے۔ ان میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہوسکتا۔ ساری کائنات میں اسی ایک کا قانون کارفرما ہے اور اسی ایک کے قانون کے تابع تمام انسانوں کو بھی رہنا چاہئے۔ اس طرح ان میں بھی وحدت پیدا ہو جائے گی۔ (وحدتِ خالق کے تصور کا لازمی نتیجہ وحدتِ قانون اور وحدتِ انسانیت ہے)۔ **اللہ الصمد**۔ وہ (خدا) خود مکتفی ہے اور باقی سب اپنی زندگی' بقا' نشو ونما اور تکمیل کے لئے اس کے محتاج ہیں۔ وہ ایک بلند و بالا مستحکم چٹان کی طرح ہے جو خود ہر قسم کے خطرات سے محفوظ ہوتی ہے اور سیلاب سے بچنے کے لئے ہر ایک اس کی طرف پناہ کے لئے جاتا ہے۔ **لم یلد ولم یولد**۔ اس نے تمام ذی حیات کو عملِ تخلیق سے پیدا کیا ہے نہ کہ تولید کے ذریعے۔۔۔ (عمل تولید میں پیدا کرنے والے کا ایک حصہ مولود میں آجاتا ہے' اس طرح والد۔۔۔ پیدا کرنے والا۔۔۔ خود ناقص رہ جاتا ہے۔ تخلیق میں ایسا نہیں ہوتا)۔ نہ اس نے اس طرح کسی کو پیدا کیا ہے نہ وہ خود کسی کے عملِ تولید کا نتیجہ ہے اور۔ **ولم یکن لہ کفوا احد**۔ اس کا ہمسر' مثیل اور نظیر کوئی نہیں۔ اس جیسا کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔

دنیا میں چند دہریوں کو چھوڑ کر باقی سب خدا کو ماننے کے مدعی ہیں لیکن خدا کوئی محسوس شے نہیں کہ اسے دیکھ کر ہر ایک' ایک جیسا مانے۔ وہ غیر مرئی' غیر محسوس اور ادراک وشعور سے بلند ذات ہے۔ اس لئے خدا کو ماننے سے مطلب یہ ہوگا کہ تم اس کے متعلق تصور کیا رکھتے ہو۔ ایک تصور کے مطابق اسے مانو تو وہ خدا پر ایمان کہلائے گا۔ دوسرے تصور کے مطابق مانو' تو وہ خدا پر ایمان کے دعوے کے باوجود' اس سے انکار ہوگا۔ خدا کا تصور وہی صحیح ہوسکتا ہے جسے خود خدا نے اپنے متعلق دیا ہے اور یہ تصور قرآن کریم کے علاوہ اور کہیں سے نہیں مل سکتا۔ لہٰذا' خدا کے اس تصور کو ماننا جو قرآن پیش کرتا ہے خدا پر ایمان کہلائے گا۔ خدا کا یہی تصور ہے جو نہایت مختصر' لیکن کمال جامع شکل میں سورۃ اخلاص میں پیش کیا گیا ہے۔ تم علم کی بارگاہ سے پوچھو کہ خدا کا اس قسم کا منزہ اور بلند تصور کہیں اور سے بھی مل سکتا ہے؟۔ اس خدا پر ایمان تمہاری کامیابی کا راز ہے۔ اس لئے کہ اس پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ تم اپنے اندر (علیٰ حدِ بشریت) اس جیسی صفات پیدا کرو۔ جو قوم اس قسم کی صفاتِ عالیہ کی حامل ہوگی' دنیا کی کونسی قوم اس کا مقابلہ کرے گی؟۔ (مفہوم القرآن)۔

سورۃ بنی اسرائیل میں ہے کہ: وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِیْرًا o

(۱۱۱/۱۷)۔ اے رسول ان سے کہو (خدا کا جو منزہ تصور قرآن پیش کرتا ہے وہی خدا کا حقیقی تصور ہے۔ اس تصور کی رو سے) یہ غلط ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہے (۲) یہ بھی غلط ہے کہ اس کے اقتدار اور اختیار میں کوئی اس کا شریک ہے۔ (۳) اور یہ بھی غلط ہے کہ اسے' اپنی کمزوری کی وجہ سے' کسی مددگار کی ضرورت ہے۔ وہ خدا بلا شریک وسہیم' تمام قوتوں کا واحد مالک ہے۔ خدا کا یہی وہ تصور ہے جو درخورِ حمد و ستائش ہے۔ **تمہاری زندگی کا مقصد یہ ہونا چاہئے** کہ اس کے نظام اور قوانین کو تمام دیگر نظامہائے حیات اور قوانینِ زندگی پر غالب کیا جائے اور یوں انسانوں کی دنیا میں بھی اس کی کبریائی کا تختِ اجلال اسی طرح بچھ جائے جس طرح وہ خارجی کائنات میں بچھا ہوا ہے۔ یہی مطلب ہے سورۃ توبہ کی آیت ۳۳ کا جس میں اللہ کا ارشاد ہے کہ: هُوَ الَّذِیٓ أَرۡسَلَ رَسُولَهُۥ بِالۡهُدَىٰ وَدِینِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهُۥ عَلَى الدِّینِ كُلِّهِۦ وَلَوۡ كَرِهَ الۡمُشۡرِكُونَ ۝۔ اللہ نے اپنے رسولؐ کو ضابطہ حیات یعنی دینِ حق دے کر بھیجا ہی اس لئے ہے کہ یہ نظام' دیگر تمام نظامہائے عالم پر غالب آئے' خواہ یہ بات ان لوگوں پر کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گذرے جو خدا کے ساتھ اوروں کو بھی شریکِ حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ کے ہاتھوں یہ نظام قائم ہوا لیکن مخالفین نے آخری خلیفہ الرسول ﷺ کے بعد خلافت کو مذہبی پیشوائیت میں اور دین کو ملوکیت میں بدل دیا۔ مسلمان پھر دورِ جاہلیت کی طرف پلٹ گئے۔ اس وقت سے لے کر آج تک مسلمان مذہبی زندگی بسر کرتے چلے آرہے ہیں۔ دنیا میں کوئی بھی مسلم ملک ایسا نہیں جہاں قرآنی نظام یعنی اسلامی نظامِ حکومت قائم ہو۔ نماز وروزہ کی پابندی' ادائیگی اور آزادی تو دنیا کے ہر ملک میں ہے لیکن ہماری اجتماعی زندگی اسلامی نہیں ہے۔

ترمذی شریف کی حدیث نمبر ۳۶۹۴ میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ میں تمہیں پانچ چیزوں کو کرنے کا حکم دیتا ہوں (۱) نظامِ ربوبیت قائم کرو۔ (۲) سربراہِ مملکتِ اسلامیہ کی بات سنو۔ (۳) اور اس کی اطاعت کرو۔ (۴) اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔ (۵) اگر ملک میں جدوجہد کے باوجود نظامِ خداوندی قائم نہیں کر سکتے تو وہاں سے کسی ایسے مقام کی طرف ہجرت کر جاؤ جہاں قرآنی حکومت قائم کر سکو۔ (ہجرت کے متعلق سورۃ النساء کی آیت ۹۷ میں اللہ کا بھی یہی ارشاد ہے) نیز اسی حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص اسلام سے پہلے والے دورِ جاہلیت کی طرف پلٹ گیا تو اس کا ٹھکانہ جہنم ہوگا۔ چاہے وہ شخص روزے رکھتا ہو۔ نمازیں پڑھتا ہو اور سچا مسلمان ہونے کا اعلان کرتا ہو۔ قرآن کہتا ہے: وَمَن یَبۡتَغِ غَیۡرَ الۡإِسۡلَامِ دِینًا فَلَن یُقۡبَلَ مِنۡهُ وَهُوَ فِی الۡآخِرَةِ مِنَ الۡخَاسِرِینَ ۝ (۳/۸۴)۔ جو فرد یا قوم نظامِ اسلام کے علاوہ زندگی کے لئے کوئی اور نظام اختیار کرنا چاہے تو میزانِ خداوندی میں اس کا کوئی وزن نہیں ہوگا آخرت میں وہ نقصان پانے والوں میں سے ہوں گے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی)

خُمس کا مذہبی اور دینی مفہوم

قرآن کریم میں خمس کا حکم صرف ایک جگہ سورۃ انفال کی آیت نمبر ۴۰ میں آیا ہے اور یہ دسویں پارے کی پہلی آیت ہے۔ اس کے علاوہ قرآن کریم میں خمس کا ذکر اور کسی جگہ نہیں آیا ہے۔ اس مسئلہ کے متعلق کچھ تحریر کرنے سے پیشتر یہاں اس بات کا اعادہ کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ خالص قرآنی نظریات کا داعی ہے اس لئے یہ ہمیشہ فرقہ پرستی سے بلند رہا ہے۔ لیکن زیرِنظر مسئلہ شیعہ حضرات کے ہاں بڑی اہمیت کا حامل ہے اور ان کے ہاں ''فروع دین'' چھ ہیں جن میں سے ایک خمس بھی ہے۔ اس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اب بھی شیعہ حضرات ہر سال کروڑوں روپے کا خمس نکال کر پاکستان کے علماء کو دیتے ہیں یا ایران کے آیات اللہ کو ارسال کر دیتے ہیں۔ اس رسالہ میں عموماً شیعہ حضرات کے نظریات سے صرف نظر ہی کیا جاتا ہے لیکن اس مسئلہ کی نوعیت ہی کچھ اس طرح کی ہے کہ ان کے نظریات کو Ignore نہیں کیا جا سکتا۔ اس رسالہ میں جو کچھ تحریر کیا جاتا ہے۔ خواہ وہ سنی حضرات کے لئے ہو یا شیعہ حضرات کے لئے، اس سے مقصود خدانخواستہ ان کی تنقید نہیں ہوتی، مقصد صرف قرآن کا موقف بیان کرنا ہوتا ہے ورنہ اصولی طور پر تو اس رسالہ کا نظریہ یہ ہے کہ مذہب سب غلط ہوتے ہیں، درست صرف دین ہوتا ہے۔

اس مسئلہ کے متعلق غور کرنے سے پیشتر ایک دوسری ضروری بات یہ پیشِ نظر رکھنی ضروری ہے کہ قرآن کریم کے ہر قانون کی اطاعت عبادت ہے اور قرآن کی ہر عبادت قانون کا درجہ رکھتی ہے۔ قرآنِ کریم انفرادی تصورِ حیات کے سخت خلاف ہے اور اجتماعی تصورِ حیات کا علمبردار ہے۔ اس لئے قرآن کریم کے احکامات یا اسلام کے قوانین کی اطاعت صرف معاشرہ کے اندر رہ کر ہو سکتی ہے۔ انفرادی طور پر خانقاہوں اور زوایا میں ان کی اطاعت نہیں ہو سکتی۔ قرآن کریم نے ہر جگہ **یاایھا الذین آمنو** کہہ کر تمام مومنین سے اجتماعی طور پر خطاب فرما کر اجتماعی قوانین عنایت فرمائے ہیں۔ کسی جگہ انفرادی طور پر **یاایھا الذی اٰمن** نہیں کہا گیا ہے۔ قرآن کریم کے

مطابق جب کسی مستقل قدر اور ذاتی مفاد میں Tie آ کر پڑتی ہے تو اس وقت ذاتی تصادم' مقابلہ میں مستقل قدر کو ترجیح دے کر اختیار کرنا عبادت خداوندی ہے اور اسی سے نفس انسانی کی نشوونما ہوتی ہے۔ ذاتی معاملہ اور مستقل قدر میں Tie معاشرہ میں ہی واقع ہوسکتی ہے۔ انفرادی زندگی میں نہیں ہوسکتی۔ قرآن کریم حکم دیتا ہے کہ جب قرض لو یا دو تو اس کو تحریر میں لے آؤ (۲/۲۸۲)۔ اس حکم کی اطاعت معاشرہ میں ہوسکتی ہے۔ کسی تجردگاہ میں اس کی اطاعت نہیں ہوسکتی۔ قرآن نے حکم دیا کہ غیبت نہ کرو (۴۹/۱۲)۔ اسی طرح قرآن نے زکوٰۃ' انفاق' ایثار' حسنِ سلوک کے حکم دیئے ان سب کی اطاعت معاشرہ میں ہوسکتی ہے۔ معاشرہ کے باہر' اللہ کی عبادت نہیں ہوسکتی۔ اس کے برعکس مذہب میں ذاتی عبادت کا تصور ہے کہ عبادت انفرادی طور پر بھی ہوسکتی ہے۔ محولہ بالا نکتہ کو پیشِ نظر رکھ کر آپ خود اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ دین میں انفرادی صلوٰۃ کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔ اسی طرح خمس اور زکوٰۃ کی صورت ہے۔ ہمارے ہاں جو زکوٰۃ اور خمس انفرادی طور پر دیئے جاتے ہیں وہ مذہب کا تصور ہے۔ دین میں قطعاً اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اب اصل مسئلہ کی طرف مراجعت کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔ وَاعْلَمُوا أَنَّمَا غَنِمْتُم مِّن شَيْءٍ فَأَنَّ لِلَّهِ خُمُسَهُ وَلِلرَّسُولِ وَلِذِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ إِن كُنتُمْ آمَنتُمْ بِاللَّهِ وَمَا أَنزَلْنَا عَلَى عَبْدِنَا يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ (۸/۴۱)۔ اور جان رکھو کہ جو کچھ تم غنیمت حاصل کرو تو اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لئے اور رسول کے لئے قرابتداروں' یتیموں مسکینوں اور مسافروں کے لئے ہے۔ اگر تم ایمان رکھتے ہو اور اس چیز کے جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری فیصلے کے دن' جس دن دونوں جماعتوں میں مڈبھیڑ ہوئی۔ یوم الفرقان سے مراد غزوۂ بدر کا دن ہے کیونکہ یَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَان کے الفاظ نے خود اس کی وضاحت کر دی ہے اس لئے کہ وہی پہلا دن تھا جس دن مسلمانوں اور کفار کے درمیان جماعتی حیثیت سے تصادم ہوا تھا۔

عربی زبان کے مطابق مال غنیمت وہ مال ہے جو میدانِ جنگ میں مسلمان مجاہدین کو کفار سے حاصل ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے جنگ سے حاصل شدہ اموال کو غنیمت یا انفال اس لئے کہا ہے کہ اس سے یہ بات واضح ہو جائے کہ یہ اموال جہاد کا معاوضہ نہیں ہیں۔ مجاہد جو جہاد اللہ کی راہ میں کرتا ہے وہ ایک فرض ادا کرتا ہے اور اس کا اجر اس کو اللہ کے ہاں سے ملتا ہے جو ابدی زندگی کی صورت میں ہوتا ہے۔ باقی یہ اموال تو اس جہاد کے زوائد ہیں۔ مال غنیمت کے سلسلہ میں عربوں کے ہاں یہ دستور تھا کہ جو سپاہی

جس دشمن کو قتل کرتا' اس کا مال و اسباب اس سپاہی کی ملکیت قرار پا جاتا۔ عربوں کے ہاں جنگ کا جذبۂ محرکہ ہی یہ تھا اور اس میں انفرادی مفاد پیش نظر ہوتا تھا۔ قرآنِ کریم نے اس کی اصلاح فرمائی کہ اسے لوٹ کا مال تصور نہ کیا جائے کہ جو جس سپاہی کے ہاتھ لگے وہ اس کو لے لے' بلکہ اس کے بجائے وہ سب سامان مملکت کی تحویل میں دیا جائے گا جسے وہ مملکت حسبِ ضرورت آیۂ کریمہ کے مقرر کردہ طریقہ کے مطابق تقسیم کر دے گی۔ لیکن یہ بات بڑی اہم ہے کہ اس کی تقسیم مملکت خود کرے گی' انفرادی طور پر اس کی تقسیم نہیں ہوگی۔ اور اس حکم کی اطاعت عبادت خداوندی ہوگی۔ حالانکہ یہ حکم ٹھیٹ دنیاوی زندگی کے متعلق ہے۔

مسلمانوں کے دونوں بڑے فرقے (سنی و شیعہ) اس آیۂ کریمہ کی جو تفسیر فرماتے ہیں وہ دونوں تفاسیر قرآن کے خلاف ہیں' روایات پر مبنی' مذہبی تفاسیر ہیں۔ اس کی خالص قرآنی نکتہ نظر کے مطابق دینی تفسیر پیش خدمت عالی ہے۔ چونکہ یہ تفسیر مروجہ مفہوم سے الگ اور منفرد ہے' اس لئے اس کو غور سے ملاحظہ فرمائیں۔

ہمارے علماء کرام جو مال غنیمت ہاتھ آتا ہے اس میں سے پانچویں حصہ پر اس آیت کا اطلاق کرتے ہیں جس میں ایک حصہ اللہ و رسول کا اور باقی حصص ذوی القربیٰ' یتامیٰ مساکین اور ابن سبیل میں تقسیم کرتے ہیں۔ مال غنیمت کا ۴/۵ حصہ وہ لشکر میں خود تقسیم کرتے ہیں۔ سوار کو دو حصے اور پیدل کو ایک حصہ دیتے ہیں۔ یہ ۴/۵ حصہ جو لشکر میں تقسیم ہوتا ہے وہ ان حضرات کے نزدیک آیۂ کریمہ کے Perview (احاطہ) سے باہر ہے۔ اس لئے اس حصہ پر تو کوئی بحث ہی نہیں ہوسکتی۔ البتہ جو پانچواں (۱/۵) حصہ ہے صرف اس کی تقسیم وہ اس آیت کے مطابق کرتے ہیں۔ پھر دوبارہ واضح کیا جاتا ہے کہ ہمارے علماء کرام کے نزدیک سارا مال غنیمت اکٹھا کر کے' اس میں سے پانچواں (۱/۵) حصہ اللہ و رسول کا حق نکال کر' بقیہ ۴/۵ حصہ مجاہدین میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک مال غنیمت میں سے اللہ و رسول کا حق صرف پانچواں حصہ ہے جس کے یہ حصص آیۂ کریمہ میں بیان کئے گئے ہیں۔

اس پانچویں حصہ کے مصارف کی تفصیل میں سب سے پہلا حصہ اللہ و رسول کا ہے۔ اللہ کا حصہ اعلائے کلمتہ اللہ کے لئے استعمال ہوگا اور رسول کا حق ان کی اپنی ذات پر' کیونکہ وہ سارا وقت سربراہِ مملکت کے طور پر خدمتِ ملت کے لئے گذارتے ہیں اور ان کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہوتا ہے اس لئے ضروری ہوا کہ اس مال میں ان کا حق رکھا جائے۔ اصل میں یہ حق ریاست کے سربراہ کا حق ہے جو حضورﷺ کے بعد آپ کے خلیفہ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ تیسرا حق ذوی القربیٰ کا ہے جس سے مراد' علماء کے

نزدیک حضورﷺ کے قرابتدار ہیں جن کی کفالت حضور کرتے تھے۔ چوتھا حق یتیموں، مسکینوں، مسافروں کا ہے جو ان میں تقسیم کیا جائے گا۔ چند جزوی اختلاف کو چھوڑ کر ہمارے علماء کرام کا یہی موقف اس آیت کے متعلق ہے جو تحریر کیا گیا ہے۔

شیعہ حضرات لذی القربیٰ میں حضورﷺ کے رشتہ دار مراد لے کر، خمس کو سادات کے لئے مختص کر دیتے ہیں اور جو حصص یتامیٰ، مساکین اور ابن سبیل کے مخصوص ہیں، ان حضرات کے ہاں، ان کے لئے بھی سیادت کی شرط لازمی ہے۔ مختصراً یہ کہ شیعہ حضرات کے ہاں سارا خمس کسی نہ کسی طرح سادات کے سپرد کر دیا جاتا ہے اور اس کے لئے ان کی دلیل یہ ہے جو آپ ملاحظہ فرمائیں گے۔

شیعہ حضرات کا موقف واضح کرنے کی غرض سے ایک اقتباس دیا جاتا ہے جس سے ان کے مسلک کی وضاحت ہو جائے گی۔ اقتباس قدرے طویل ہے لیکن اس کے علاوہ کوئی اور چارہ نہیں تھا کہ ان کا اپنے الفاظ میں نظریہ تحریر کیا جائے، میں خود شاید اتنی وضاحت نہ کر سکتا۔ مشہور تفسیر، تفسیر القرآن کا یہ اقتباس ہے یہ تفسیر الحاج حضرت ادیب اعظم مولانا سید ظفر حسن صاحب کی تحریر کردہ ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

''یہ تقسیم کا حکم جنگ بدر کی غنیمت کے وقت ہوا۔ احادیث سے یہ ثابت ہے کہ اللہ کا حصہ رسول کا حصہ ہے اور رسول کے بعد خدا اور رسول کے حصہ کا مالک امام منصوص من اللہ ہوگا خلاصہ یہ ہے کہ رسول کا حصہ تو ان کے قربتداروں کو دیا جائے گا جو یتیم و مسکین اور پردیسی ہوں۔ یہ شرط ہے کہ قرابتدار رسول ہوں۔ یعنی یہ سب حصے رسول اور ان کی اولاد کے لئے خاص ہیں، خمس میں سہمِ امام علیحدہ کر کے دوسرا حصہ سادات کی ان صفوں میں تقسیم کیا جائے گا جن کا ذکر آیت میں ہے۔ چونکہ اولاد رسول پر غیر سید کی زکوٰۃ جو صدقہ ہے حرام ہے لہٰذا بجائے اس کے ان کا حق خمس میں باقی رکھا گیا ہے۔

عقل و انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ جو خاندان حکمران ہو اس کی اولاد کے لئے کچھ ایسا بندوبست کیا جائے کہ وہ اپنی زندگی باعزت طریقہ سے گذار سکیں اور لوگوں کے سامنے ان کو ہاتھ پھیلانے کی ضرورت پیش نہ آئے کیونکہ اس میں شاہی خاندان کی ذلت یقینی ہے۔ تمام دنیا کی سلطنتوں میں ایسا ہی ہوتا ہے اور رسول جو دین اور دنیوی دونوں حیثیت سے مسلمانوں کے بادشاہ ہیں لہٰذا قدرت کیسے گوارا کر سکتی تھی کہ ان کی اولاد کے حقوق کا تحفظ نہ کیا جائے۔ غیر سید کی زکوٰۃ کو اس لئے سادات پر حرام کیا گیا ہے کہ وہ صدقہ ہے۔ میل

کچیل ہے اس کو لے کر کھانے میں اولاد رسول کی توہین ہے۔'' اقتباس ختم ہوا۔

حضرت محترم مفسر صاحب نے پہلے ہی تحریر کر دیا کہ یہ سب کچھ نظریات انہوں نے احادیث سے اخذ کئے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس اقتباس سے بنوعباس کے دورِ ملوکیت کی زینت خوب آشکارا ہو رہی ہے۔ شیعہ حضرات کا فقہ' فقہ جعفری کہلاتا ہے۔ حنفی فقہا کو براہ راست خلفاء بنی عباس کی سرپرستی حاصل تھی۔ لیکن شیعہ فقہا کی یہ صورت نہیں تھی' خلفاء بنی عباس عموماً ان کے خلاف تھے۔ لیکن فقہ جعفری' فقہ حنفی کے ساتھ ساتھ اس کے ردعمل (Re-action) میں اس کے متوازی بنتا چلا گیا۔ اس کے ماخذ (Source of Law) بھی وہی قرآن واحادیث و اجماع ہیں۔ ان کی احادیث جو ماخذ قانون بنتی ہیں وہ سنیوں سے الگ ہیں۔ اجماع میں بھی قول معصوم کی سند کا ہونا ضروری ہے۔ لیکن قیاس ان کے ہاں نہیں ہے۔ مجھے فقہ جعفری کی زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ اس لئے میں اس کے لئے مزید لکھنا نہیں چاہتا۔ چونکہ اس کی ابتداء حضرت امام جعفر صادق نے کی تھی اس لئے یہ فقہ ان کے نام نامی و اسم گرامی کی طرف منسوب ہے۔ لیکن یہ بھی طے شدہ بات ہے کہ جس طرح آج دنیا میں امام ابوحنیفہ کی کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔ اسی طرح حضرت امام جعفر صادقؒ کی بھی کوئی کتاب دستیاب نہیں ہے۔ ان دونوں فقہ کا انتساب ان دونوں حضرات گرامی قدر کی طرف مشکوک وظنی ہی ہے۔

پھیر پھرا کر' کسی نہ کسی طرح سارا خمس سادات کو دینے کے لئے اس آیت کے مرکب اضافی ''ذی القربیٰ'' کو اس نظریہ کی تائید میں پیش کیا جاتا ہے کہ اس سے رسول اللہ کے قرابتدار مراد لئے جاتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم میں ذی القربیٰ (قرابتدار) کی نسبت رسول کی طرف بیان ہی نہیں کی گئی۔ مولوی فرمان علی کا قرآن کریم کا ترجمہ شیعہ حضرات میں مستند ترین ترجمہ شمار ہوتا ہے۔ انہوں نے اس آیت میں ذی القربیٰ کو رسول اللہ کے قرابتدار ثابت کرنے کے لئے رسول کے الفاظ قوسین (بریکٹ) میں اضافہ کئے ہیں۔ کیوں کہ قرآن کا ترجمہ اس کے لئے کافی نہیں تھا۔ الفاظ قرآنی سے رسول کے قرابتدار ثابت نہیں ہوتے اور اس ترکیب سے رسول کے قرابتدار مراد لے لئے جاتے ہیں۔ آیت سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ یہ رشتہ دار کس کے ہیں۔ ہماری روایات نے اس کو رسول اللہ کے رشتہ دار بنایا ہے۔ اسی وجہ سے قرآن کے تراجم میں بھی رسول کے قرابتدار لکھ دیے گئے لیکن قرآن کی آیت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ یہ رسول اللہ کے رشتہ دار ہیں۔ اس لئے مترجمین قوسین (بریکٹ) میں اس کا اضافہ 'رسول کے'

کر دیتے ہیں' جو قرآن میں کھلم کھلا اضافہ ہے۔لیکن سنی علماء شیعہ حضرات کی اس معاملہ میں اس لئے تردید نہیں کرتے کہ ان کی اپنی حدیثوں میں بھی اسی طرح آیا ہے۔

اس آیۂ کریمہ سے پہلے ۴۱ آیات کریمات میں جہاد کا ذکر چلا آ رہا ہے اور اس آیت کے بعد بھی جہاد کی آیات آ رہی ہیں۔اس آیت کا نزول بھی جنگ بدر میں ہوا ہے جس کی شہادت یوم الفرقان یوم التقی الجمعٰن سے ہوتی ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ ذی القربیٰ سے مجاہدوں کے قرابت والے مراد ہیں۔ یعنی جن خاندان والوں کے جوان اور کمانے والے افراد جنگ میں بہادری دکھا کر جام شہادت نوش کر رہے ہوں ان کے قرابتداروں' اہل خانہ' کی ضروریات زندگی کے لئے خمس کی مد سے ان کی امداد کی جانی چاہئے تاکہ مجاہدین اس بات سے مطمئن رہیں کہ اگر وہ قتل کر دیے جائیں تو ان کے عزیزوں کی کفالت خمس سے ہوتی رہے گی۔

ہمارے علماء کرام کا یہ تسامح ہے کہ انہوں نے اس آیت کا اطلاق پورے مال غنیمت پر نہیں کیا۔قرآن کریم کے احکامات اور آیت کریمہ پورے مال غنیمت کا احاطہ کرتی ہے علماء کرام اس آیت کا اطلاق صرف ۵/۱ پر کر کے ۵/۴ حصہ کو پھر مجاہدین پر تقسیم کر دیتے ہیں جو خلاف قرآن ہے۔

آیت کی اس تفصیل اور اس کے پس منظر کے بعد آپ مفہوم القرآن کی تشریح ملاحظہ فرمائیں۔ آپ محسوس کریں گے کہ اس آیت کو کس درجہ صاف کر دیا گیا ہے۔

''یاد رکھو میدان جنگ میں جو مال غنیمت بھی ملے گا اس میں سے پانچواں حصہ ''خدا اور رسول''۔یعنی مملکت کی انتظامی ضروریات۔ کے لئے رکھ کر باقی ضرورت مندوں کی ضروریات پوری کرنے میں صرف کیا جائے گا۔ مثلاً (میدان جنگ میں جانے والوں اور کام آ جانے والوں کے) اقرباء کے لئے یتیموں اور معاشرہ میں بے یارومددگار تنہا رہ جانے والوں کے لئے جن کا چلتا ہوا کاروبار رک گیا ہو' یا جو کسی حادثہ کی وجہ سے کام کاج کے قابل نہ رہے ہوں۔ نیز ان مسافروں کے لئے جو مدد کے محتاج ہوں۔''

اس سلسلہ میں ایک غور طلب بات یہ بھی ہے کہ اب حالات بدل گئے ہیں۔اب جنگ کی وہ صورت ہی نہیں رہی۔ جزیہ کا حکم بھی قرآن میں صرف ایک جگہ ۹/۲۹ میں آیا ہے۔ جزیہ بھی جنگ سے متعلق ہی تھا جس ملک کو فتح کر لیا جائے اس کے شہری جزیہ دیتے تھے۔ جزیہ صرف اس بات کی علامت تھا کہ شہریوں نے (Surrender) کر دیا ہے۔ یہ مفتوح ہونے کا ایک Token تھا اب چونکہ جنگ میں یہ صورت ہی پیش نہیں آتی اس لئے اب جزیہ کا

بھی کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اسی طرح خمس کا معاملہ ہے۔ اب جب مالِ غنیمت ہی ہاتھ نہیں آتا تو خمس کس چیز کا۔ نیز یہ بات بھی پیش نگاہ رہے کہ جزیہ وخمس دونوں کا تعلق اسلامی حکومت سے ہے۔ یہ عجیب تماشا ہے کہ اسلامی نظام کو ختم ہوئے صدیاں گذر گئیں جزیہ بھی اب کہیں ادا نہیں ہو رہا ہے۔ لیکن خمس کی رقوم مولوی حضرات موصول کر رہے ہیں۔ خمس کی ادائیگی صرف اس مال غنیمت سے ہوتی ہے جو جہاد کے بعد حاصل ہو اور جہاد صرف اسلامی حکومت کر سکتی ہے۔ غیر اسلامی حکومت جہاد نہیں کر سکتی اس لئے خمس کی ادائیگی کے لئے لازم ہے کہ اسلامی حکومت کا قیام ہو۔ دینی نکتہ نگاہ سے اس کے علاوہ خمس کی ادائیگی کی کوئی اور صورت نہیں۔ البتہ مذہب میں خمس کا دینی طریقہ ہے جو آج کل رائج ہے کہ لوگ انفرادی طور پر مولویوں کو خمس ادا کر دیں۔

وآخر دعوانا الحمدلله رب العالمين

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

﴿ڈاکٹر انعام الحق﴾

حکمت کی باتیں

(۱) (سقراط) مجھے بس دور سے کوئی کتاب دکھا دو اور پھر ساری دنیا میں لئے پھرو۔

(۲) ایک بلند و قابلِ قدر مقصد میں ناکام رہنا بھی کچھ کم قابلِ قدر نہیں۔

(۳) دولتمند اور سوداگر صرف سمجھتے ہی ہیں کہ وہ کام کر رہی ہیں' حالانکہ وہ کچھ بھی نہیں کرتے۔

(۴) جس شخص کو کسی چیز کی آرزو نہ ہو' اس کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں۔

(۵) بصیرت اور تنقید کی قوت ذہن میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب بصارت جواب دینے لگ جاتی ہے۔

(۶) (لاک) جو شخص وحی کے لئے جگہ بنانے کی کا طرعقل و بصیرت کو باہر نکال دیتا ہے' وہ وحی اور عقل دونوں کے چراغ گل کر دیتا ہے۔

(۷) (برگساں) عقل ایک خاص مقصد کے لئے پیدا کی گئی ہے' جب ہم اسے اس مقصد سے بلند مقاصد کی طرف لے جانا چاہتے ہیں' تو وہ اسبلند سطح کے متعلق ممکنات کا سراغ دے سکے تو شاید' ورنہ وہ حقیقت کا پتہ تو کسی صورت میں دے ہی نہیں سکتی۔

(۸) (جود) حقیقت یہ ہے کہ ہم جن علوم کو استدلالی کہتے ہیں' ان کی اصل و بنیاد غیر استدلالی ہوتی ہے۔

(۹) (افلاطون) اربابِ فکر عقل کے تجرباتی طریقے سے کچھ بنائیں گے' اسے پھر مٹا دیں گے۔ یہی کچھ کرتے رہیں گے تا آنکہ وہ انسانی راستوں کو حتی الامکان' خدائی راستوں سے ہم آہنگ کر لیں۔

(۱۰) ہم بہت سی باتوں کو دوسروں کی سند سے مانتے ہیں' دیکھنے کا کام یہ ہے کہ ان میں سے کونسا معقول ہے۔

(۱۱) سائنسی قوانین درحقیقت کدا کی عادات کا پتہ دیتے ہیں۔

(۱۲) جھوٹ سے دوسروں کو فریب دیا جاتا ہے لیکن بے ایمانی میں اپنے آپ کو فریب دیا جاتا ہے۔

(۱۳) (سارتر ے) جب کوئی شخص فیصلہ کرتا ہے تو یہ فیصلہ تمام دنیا کے لئے ہوتا ہے۔

(۱۴) اقدار کے حصول کی کوشش ہی زندہ رہنے کے مترادف ہے۔

(۱۵) انسان اس چیز کا ذمہ دار نہیں جس کا وہ خود سبب نہ ہو۔

(۱۶) جبلت صرف اپنے جسم کے اوزاروں سے کام لینا جانتی ہے اور شعور جسمانی اوزاروں سے الگ مادی اوزار بنانا اور انہیں استعمال کرنا بھی جانتا ہے۔

(۱۷) (باریو) یہ عقیدہ کہ کدا نے انسان کو اپنی حمد و ستائش کے لئے پیدا کیا ہے' انسانیت کے لئے ذلت اور خود خدا کے شایانِ شان نہیں۔

(۱۸) (سیمویل) انسان کو قوتِ ارادہ عطا کی گئی ہے جس سے وہ اپنے رجحانات و میلانات پر ضبط بھی رکھ سکتا ہے۔

(۱۹) (برگسان) ہم بڑی حد تک وہی ہوتے ہیں جو کچھ ہم کرتے ہیں اور اس طرح مسلسل اپنی تخلیق کرتے رہتے ہیں۔

(۲۰) حقیقت یہ ہے کہ انسان فطرت کو متاثر کرتا ہے فطرت انسان کو متاثر نہیں کرتی۔

(۲۱) (دوستوسکی) اگر خدا کے وجود کو تسلیم نہ کیا جائے تو دنیا میں سب کچھ جائز ہو جاتا ہے۔

(۲۲) ہم یا تو خدا کے بندے بن سکتے ہیں یا انسان کے۔

(۲۳) جس طرح ازمنہ مظلمہ میں مذہب کے نام پر انسانی خون بہایا جاتا تھا' آج انسانی جانیں وطنیت کے دیوتا کی بھینٹ چڑھائی جاتی ہیں۔

BASIC STRUCTURE OF AN ECONOMIC SYSTEM

By

Maj Gen (Rtd) Ihsan-ul-Haq

The Quran offers very fundamental suggestions for a foundations of an economic system. As usual, the Quran only offers a structure. Details would have to be filled in by Muslims of any time and space to suit their requirements. The broad principles are as follows:-

a) Land is the basic productive unit. It contains all the ingredients necessary for nourishment of humanity.
b) It must be owned collectively to produce maximum results.
c) Only work should result in wages. Capital must not produce money.
d) Having earned an income with hard work, a man should use as much of it as he needs to fulfil his basic requirements. Any surplus should be kept available for collective use by humanity.

We shall start of this discussion with a consideration of 'Al Ardh' الارض the term used by the Quran for land and all its potentials.

"And certainly We established you in the earth and made therein means of livelihood for you. You do not seem to be deriving full benefit from it - (tashkaroon)… 7/10.

There are immense means of sustenance stored on and under the earth, a free gift from Allah. All that what man has to do is to discover these resources and grow them for use by humanity.

"He it is Who made the earth subservient to you, so go about in the spacious sides thereof and eat of His sustenance…" 67/15

"And the earth We have spread it out and made with firm mounts and caused to grow in it of every suitable thing. And we have made in it means of subsistence for you and for him for whom you provide not. And there is not a thing but with Us are the treasures of it, and We send it not down but in a known measure…" 15/19-21

Sending in known measures is entirely dependent on the will of man. Whatever he determines as his requirement, he will not find his Rabb (God) wanting in providing it because Quran says:

"There is no living being on earth for which Allah does not have a responsibility to provide means for its sustenance. Allah knows requirements of living beings at all stages of life. It is all on record … 11/6

The point is clearly made that the basic essentials from which consumer goods are made by man for sustenance of life are available in plenty in the universe. On behalf of Allah, man has to work hard and constantly to convert these basic essentials in required quantity so that no living being is deprived of its basic needs.

"And see to it that you do not deprive your children of nourishment because you fear you will become destitute. The provision of means of sustenance for you and your children is Allah's responsibility… 17/31.

And the same theme is emphasized in verse 6/152. The earth contains a tremendous quantity of resources necessary for sustenance of human and animal life. This free gift of Allah is inexhaustible. Men, as Allah's soldiers on earth, must discover these resources, convert them into usable form and guarantee their provision to every living being so that life continues on earth.

So that men are enabled to fulfill this mission, Allah recommends that land or for that matter all means of productions, should remain in collective custody.

"And Allah's is the heritage of the heavens and the earth …." 3/180

The first implication of earth being Allah's heritage is that it must remain in God possession and not be parceled out on an ownership basis to humans. The second and a very important implication is that it must by used on behalf of Allah only by such institutions who guarantee that its product will be used for the good of entire humanity in an equitable manner. Thus ensuring that no living being is deprived of means of nourishment.

"And We have made the earth, (means of all production) for the collective use of entire humanity…. 55/10.

That the earth and whatever is in it belongs to Allah and not to individuals is again referred to in verses 19/40 & 57/10.

"Verily, to Us belongs the earth and whatever is on and under it. And it is, in the final analysis Our Laws which determine consequences of human action……." 19/40

"And what has come over you that you do not make available to entire humanity whatever treasures of nourishment there are in the heavens and on earth, which are Allah's heritage…." 57/10.

So far, it is clear that according to the Quran, land and other means of production are owned by Allah i.e. collectively and not individually owned. As to how land should be administered so that maximum benefit should accrue to humanity, much of this

arrangement has been left to the discretion of mankind. As time goes by, people in different countries will evolve different methods to maximize production and its equitable distribution. A few broad principles are, however, offered by the Quran with regard to this. In verse 79/30-34, Quran describes various stages of evolution at the end of which land emerged as a source of production of means of nourishment for humans and animals.

"And the earth was cast away from the nebula. He brought forth from it its water and its pastures. And the mountains, He made them firm and then enabled the earth to be a provision of sustenance for you and your Animals….." 79/30-33.

This theme is further explained.

"Then, let man look at his food. How We pour down abundant water. Then, cleave the earth, cleaving it asunder. Then, cause the grain to grow therein, and grapes and clover, and the olive and the palm, and thick gardens, and fruits and herbage. All provisions of nourishment for you and your cattle…" 80/24-32

It will be noticed that in man's efforts to make land a useful means of production, nature provides to him a lot of free and vital help without which production would not be possible. Hence, the distribution and management of this free gift of Allah should be in such a manner that it should be available to all those who need it in an equitable manner.

"For this purpose, He mad mountains on earth (for water system) and provided in it a potential for production of means of sustenance in four seasons- all this so that land should remain available to all needy persons for fulfillment of their needs …" 41/10.

Society must decide as to who are in need and are capable of handling it best. Such people should keep managing it for as long as the collective will of the people so desires.

"Verily earth belongs to Allah and He hands out its management to whomsoever he considers fit…" 7/128.

Land is a free gift of Allah. From it are produced a variety of foods for sustenance of mankind In the process of production, Allah provides free help in abundance. Without this help, production would not be possible. So, Allah and man are partners in the process of production. Both deserve to be compensated for their effort. Man is asked to keep his fair share of production as a reward for his effort. As for as Allah's share is concerned, He asks that it be given to those who are temporarily incapable of making their own living. This way, both parties will get their fair share. All this is beautifully described in a poetic passage of the Quran.

“See what you sow? Is it you that cause it to grow, or are We the causer of growth? If We pleased, We would make it chaff, then would you lament; Surely, we are burdened with debt; Nay, we are deprived. See you the water which you drink (and which is essential for your crops): Do you bring it down from the clouds or are We the bringer ? If We pleased, We could make it saltish; why give you not thanks? See you the fire which you kindle? (or the heat provided by the sun for your crops). Is it you that produce the trees for it or are We the producer? Now think deeply about this production process and remember (that whatever is surplus to your requirements) is a means of sustenance for those who are temporarily deprived…” 56/63-73.

In order to fulfill their basic needs, human beings required income. What is legitimate income? The Quran gives a clear guidance.

“And that man can have nothing but what he strives for : And that his striving will soon be seen. He will be rewarded for it with the fullest reward…” 53/39-41.

Income, then, is a compensation for labour where results are demonstrable; in other words, productive labour. The Quran does not recognize as legitimate that income which is not as a result of labour. Unearned income (out of capital only) is termed as usury -اوبر (Riba) by the Quran and it is strictly prohibited.

“O you who believe do not acquire unearned income. You think it increases your wealth. It is not true. In fact it decreases it….” 3/130

When you make money from investment in stocks and bonds, rentals from your property, a return on absentee landlordship or games of chance, you seem to be adding to your personal wealth. But because, as a result of this income to you, no productive goods have been added into national resources, such money will only add to inflation which will hurt not only yourself but also other more productive workers whose hard work has added more usable goods in the market. When people insist on continuing to live in a society where mere money, not allied with hard work and productive labour, makes more money, such a society becomes unbalanced resulting in lawlessness and disorder. A proper course would be to support the hard workers and give them such wages as would ensure for them a decent way of life. The Quran terms this a friendly help هقدص (sadaqa) as opposed to usury اوبر (Riba). Only such a course of action would ensure the development of the society as a whole and ensure a peaceful and comfortable life for all when هقدص (sadaqa) is encouraged and اوبر (Riba) is not.

"As for those who insist on acquiring unearned income (out of capital only) for themselves, they are like people bitten by a snake. Like mad people they run hither and thither (Greed for making more and more unearned money results in this state of mind). They argue that they are involved in honest trading. But they should know that God allows making money with productive labour and prohibits unearned income. To those who pay attention to divine advice and refrain from acquiring unearned income, the past is past. They do pay for their past failing but ensure future peace. If, on the other hand, they insist on continuing with their nefarious activity, there is disaster for them. It is a law of nature that societies based on unearned income perish and people who support a system in which productive labour alone is allowed to prosper…" 2/275-276.

According to the Quran, if an individual or a set of people following a wrong path, wish to adopt a correct course of action, all they have to do is to retrieve their steps, come back to the place from where they went to the wrong path هبوت (Taubah) and then embark upon the correct path عمل صالح (Amal-e-Salih). If a people living in a system where unearned income is encouraged, wish to avoid further consequential disaster, they must get rid of this system, resort to هبوت (Taubah) and instead adopt a policy where honest, hard, productive work provides a decent way of life,

"O Believers, get rid of your old system of acquiring unearned income if you wish to avoid the consequences of adoption of an unjust course of action. But if you insist on keeping to this path, then be ready for war against God and his apostle This is what ربو (Riba) will result in. on the other hand, if you retrace your steps, you can at least get back your original sum (without addition of unearned amounts). Neither should you exploit others nor allow yourself to be exploited by others. If and when you feel that the man owing you your original sum has a liquidity problem, allow him installments for a mutually fixed period of time. Better still, if you can afford to forget about this original sum also if circumstances so require, it is good for both of you… " (2/278-280).

These are the steps recommended by the Quran when people decide to adopt a just system. It would, understandably, be gradual change if people feel that an abrupt adoption of an ideal system would result in extreme hardships. Developed nations are working towards a zero rate of interest. Those with a relatively lower rate of interest (and hence lesser unearned income) have already seen that their economics improve as a result. Inflation is much lesser in countries with a lower rate of interest and if such rates are further, reduced, inflation will, hopefully, be nearly eliminated. In a decent society, this will be an incentive for the people not to resort to acquiring unearned income by various methods. War against God and prophet will cease. People will observe for themselves that.

“When you think that you increase your wealth by resorting to unearned income, it is not in fact so. But when you support people who earn money with honest, hard, productive labour, you add to national wealth…” 30/39

The Quran does not suggest laying any limits on income that a man or woman can make provided it is done through honest, productive hard work. The question arises as to how much of his income a man keeps for his own use and what proportion he makes available to the society for collective use to promote common good. The Quran suggests the establishment of a نظام زکوۃ (Zakat System) by the state according to which the state takes over certain responsibilities for fulfilling the basic needs of individuals while the individual, in turn, provides the resources for building an infrastructure through which peoples’ needs are taken care of. For this purpose, the state and the individual enter into a solemn agreement.

“(According to this agreement) Allah (the state functioning according to the dictates of the Quran) buys from the believers their lives and their belongings and gives to believers in lieu a life in Jannat (a state of society in which there is guarantee for food, clothing, accommodation and other basic needs of individuals). Individuals work hard for the establishment of such a society and if necessary, fight for their right to do so. Such an agreement as is being entered into with believers in Quran has before been entered into with believers in the Bible and Taurah. Those of you who live by the provisions of this solemn agreement, let them rejoice over their bargain. Let them remain content that Allah will honour His part of the agreements. It is a great accomplishment for the believers… 9/111.

The state must guarantee fulfillments of all nourishment needs of an individual when he enters into such an agreement.

“Surely, it is guaranteed to you that you are not hungry, nor naked. And that you are not thirsty therein and exposed to the sun’s heat.” 20/118-119.

In practical life, the state and the individual have to agree on what part of an individual’s belongings are to be acquired for collective use. The Quran gives a broad guidance.

“They ask you as to how much of our belongings you ask of us to keep available for collective use. Tell them, whatever is surplus to your genuine requirements for leading a good, peaceful life…” 2/219.

In another passage, the Quran mentions some of the people for whom the Muslims should keep their surplus income available.

"They ask you about the disposal of their surplus belongings. Tell them that you should keep these available for use by your needy children, parents, others nears and dear to you, those who have been left without economic support, those whose business has come to a halt and those who have been forced to take refuge…" 2/215

The Muslims stuck to this kind of an arrangement for a number of years in their early history. It resulted in peace and prosperity for themselves as well as enlightenment and a good life for a large number of people in the world wherever this message was acted upon. The division of taxes in two segments, that is a secular tax and religious tax (the latter fixed at 2-1/2% of annual savings) has not sanction in the Quran. This system seems to have been introduced by autocratic rulers for their convenience with help from some misguided religious scholars.

Whereas individuals keep their entire savings at the disposal of society for use on collective good, the state has to acquire only a worked out sum to undertake its duties. Such duties include maintenance of law and order, provision of communications, educations, health and such like facilities. The Quran mentions following sources of state income :

a) (زکوۃ) Zakat. This is the sum paid b the people at a rate worked out by the state for fulfilling its duties to achieve collective prosperity. The Quran lays great stress on this and repeatedly asks the people to participate in this programme to undertake nourishment and growth of society in all spheres of activity.

b) صدقات Sadaqat Whereas (زکوۃ) Zakat could take care of expenses under normal circumstances, there may be abnormal and unplanned occasions for which the state has not catered in its plans. Voluntary subscriptions or additional levies are termed as صدقات Sadaqat and are meant to cover such emergencies.

9/60

"Such voluntary subscriptions or emergently imposed levies are for use by.

1. Such people who, for some genuine reason, are not capable of earning for themselves.
2. People who were running a business or earning a living but are temporarily deprived due to some emergency.
3. People employed on collection of such revenues.
4. For such people who would like to join the ranks of believers but are prevented from doing so for some economic reasons.
5. To achieve freedom for such people who are denied human rights.
6. To alleviate the debt burden of such people who have come to this state of indebtedness for no fault of their own.
7. People seeking refuge from exploiters.
8. And generally for promoting the good of humanity in any way thought fit by the state…" 9/60

In ideal circumstances, such emergencies should not take place. But sometimes they will. The state should not be found wanting in these circumstances.

c) انفا ل Anfal. Any income that accrues to the state in addition to its fixed levies. Such income in its entirety is used by the state.

"They ask you regarding income which accrues to the state in addition to what it has planned for as a fixed or emergency levy, tell them that the entire such income goes (to the state treasury) to be utilized as per guidance of Allah and Rasool…" 8/1

d) غنيمة Ghaneema. All reparations received from those who have imposed a war on the believers. One fifth of such income goes straight into government treasury.

"And keep in mind that from whatever you acquire on the battle field, one fifth goes to the state treasury for general administration and the rest of it is used by the state to cater to the needs of war affected people like relatives of war casualties, those left without support as a result of war and those whose business is affected by war etc… 8/41.

It was customary for the Arabs to go to war because they were allowed to keep for themselves whatever they snatched from their enemies as a result of war. The Quran stopped this custom because there is no provision for a "war for profit" in an Islamic state. This has also been discussed in more detail in the chapter relating to war and peace.

e) (فیٔ) Fai. This is an income from the enemy or from other sources which accrues not as a result of war

"During these expeditions, whatever properties come your way for which no war like action is required to be taken, these goes entirely at the disposal of the state (as explained earlier) . According to state discretion, these should be distributed among soldiers, their near and dear one, those left without economic support, those whose business comes to a halt due to no fault of their own, those rendered without refuge and those who were forced to migrate because their homes and properties were forcibly taken away from them. To whomsoever the state gives these resources at her discretion, it must by ensured that they do not keep circulating amongst the richer people in your society…" 59/6-8.

The cardinal point made here is that government revenues are meant for alleviation of distress among the needy. They should be assisted so that they become economically self sufficient again and thus become a productive member of the community. Capital must not be allowed to keep circulating among the more prosperous members of the society. On the other hand, the latter should part with some of their comforts to rehabilitate the former. This has also been discussed in chapter relating to war and peace. With Change in times, other means of income will accrue to the state. The principle given by the Quran is that such incomes are not spent for personal needs of individuals but for the common good of humanity.

In a state where principles of an economic system as suggested by the Quran have been adopted, there is no incentive for individuals to accumulate wealth for themselves. In return for putting in hard, productive labour society is obliged to provide the workers their basic needs for leading a decent life. They can not own any immoveable property, anyway, because the system does not allow ownership of land by individuals. For a normal society, it will take a long period of time to change over its system to an arrangement suggested by the Quran. The Quran understand this and suggests legislation for a gradual, orderly and peaceful evolution. If, while a society is in the process of an evolution, some people do possess property, the Quran asks them to make a will so that, in their own judgment, resources left by them after their death are reserved for use by such people who have a more urgent need for them than others.

"If you are leaving any property after your death, it is incumbent upon you to make out a will before your death in the name of your parents, children and other members close to you according to law. It is emphasized that you must do so." 2/180

It may be mentioned in passing that such a will must be witnessed by at least two people (5/106) and can be questioned in a court of law if judged to be unjust (2/182).

" O you believers, call to witness between you, when death draws nigh to one of you, at the time of making the will, two just person among you……" 5/106

"But if one fears a wrong or a sinful course on the part of the testator, and effects an agreement between the parties, there is no blame on him…" 2/182

If after the provisions of a will by the deceased have been complied with and his other liabilities squared off, there is still some property left over, then it is to be distributed according to a formula suggested by the Quran.

"Allah enjoins you concerning your family: for the male is the equal of the portion of two females, but if there be more than two females, two thirds of which the deceased leaves is theirs, and if there be one, for her is the half. And as for his parents, for each of them is the sixth of what he leaves, if he has a child; but if he has no child and only his two

parents inherit him, for his mother is the third; but if he has brothers, for the mother is the sixth, after squaring off a will by the deceased and any liabilities that he owes (4/11).

And yours is half of what your wives leave if they have no child; but if they have a child, your share is a fourth of what they leave after payment of deceased's will or liabilities. And theirs is the fourth of what you leave if you have no child, but if you have a child, their share is the eighth of what you leave after payment of your will or liabilities. And if a man or a woman, having no children leaves property to be inherited and he (or she) has a brother or a sister, then for each of them is the sixth, but if they are more than that, they shall be sharers in the third after payment of the will made by the deceased or any loan owned by him or her. This is an ordinance from Allah…" 4/12.

There are one or two more places where distribution of property is mentioned but it must be noted that all this is if the deceased leaves any property. As can be noted from the above quotations from the Quran, shares accrue ONLY after any debts owed by the deceased are paid off and the provisions of a will made by him have been complied with. Whereas successive Muslim administrations have the right to fill in any gaps that might appear in time by fresh legislation, they are NOT authorized to make any alterations whatsoever in divine injunctions. For instance, a general belief that a will can be made only in respect of one third of the property being left behind by the deceased or that a will can not be made in favour of a certain category of people has no mention in the Quran. On the other hand, it is a clear violation of a divine injunction.

For smooth running of administration and economic activity in communities, people have to be assigned for various kinds of jobs. Some jobs require skill. Others require more of muscle. Some are desk jobs, or technical or non technical nature. Others are outdoor jobs which require running about. All such categories of people are interdependent on each other. All economic activity requires their collective effort for useful production. Some have to work in a position subordinate to others so that work proceeds smoothly with discipline.

"Do they think they distribute capabilities of production amongst people. No it is We who have given different earning capacities to different people. In this process, some people have higher ranks than others. Some are made subordinate to others (for efficient production)… " 43/32.

But this should not mean that people with better earning capacity should appropriate to themselves a major part of what they produce collectively. After all, a superior earning capacity is a gift of God, bestowed for a purpose.

"It is true that some amongst you have a higher earning capacity than others. This is God's gift. Why do these people with a higher earning capacity not understand that they must part with their surplus and let their subordinates, with lower earning capacity, have it

so that they can all be equal sharers in the bounties of God. Do they question the fact that their higher capacity is a gift of God… " 16/71

Dignity of labour is here stressed and their right to earn a decent living is highlighted notwithstanding their being " Blue collar". All human beings are born equal and are entitled to a dignified and graceful living whatever their status in life.

God has defined value system concerning an economic system in fair detail. But there is one cardinal point on which it lays the greatest stress, repeated in passage after passage. And that point is to urge human beings to willingly give their belongings and endeavour for maintaining a healthy balance in the universe. Let us recall the solemn agreement between God and man in verse 9/111 mentioned earlier. The man gives his entire belongings and his life, if necessary, for bringing about peace and prosperity in the universe. This would be possible only if a mans was to seek guidance from God; Left to himself.

"A man wants to live for himself and denies to others the fruits of his labour thus showing ungratefulness to God…" 100/6

For living an affluent life, independent of others in the society, he is tempted to accumulate wealth.

"He has a very great longing for accumulating wealth …" 100/8

But he does not foresee that such accumulation of wealth is of no use to him when the chips are down. Unbalanced distribution of income creates major disturbance in societies and it is the wealthier ones who come to major harm.

"And those who hoard up gold and silver and do not keep it available for people as suggested by God, announce to them a painful chastisement on the day when their accumulated gold and silver will be heated in the fire of hell (in this world in the first instance), then their foreheads and their sides and their backs will be branded with it: This is what you hoarded up for yourself, so taste what you used to hoard … 9/34-35.

They will want to know what brought them to this end. They will realize it for themselves.

"What is it that dragged you in this hellish state of affairs. They will say it is because we did not follow the path suggested by God. We did not help with our resources those whose business had come to a stand still…"74/42-44.

If they were following the path of God, not only would they have personally helped with their resources those who were in need but also would have urged their class of people to co-operate in this noble cause.

"(on the day of reckoning) My wealth has not helped me. My authority, which I had due to my wealth, has gone from me… " 69/28-29

Because;

"Nor did he urge himself or his ilk to divert their resources towards the needy …"69/34.

At a time when the society was in a state of imbalance, they failed to honor their agreement with God and did not make available their resources for restoration of balance.

"O you who believe, make available from what We have given you before the day comes when there is no bargaining (you will not be able to pay out of your trouble) nor friendship (your friends will desert you) and nobody will stand up for you to help you..." 2/254.

If these wealthy people think that on the day of reckoning, their acts of worship and apparent following of dogmas will be a substitute for the real noble act that is the diversion of their resources for help to the needy, they are wrong.

"It is not righteousness that you turn your faces towards the East and the West but righteousness is to give away your wealth in the cause of God, to give of your resources to your near and dear ones, the orphans, the needy, the wayfarer, the ones asking for assistance to stand back on their feet and to set slaves free…" 2/177.

In fact, you get nowhere near the path of righteousness unless you make available your accumulated resources which you love so dearly for restoration of prosperity in society.

"Never ever can you come near the path of righteousness until and unless you make available the wealth you so dearly love for the common good…" 3/91

These accumulated resources do not belong entirely to those who think that they have single handedly earned them. Many a people who participated in the production of these resources have been deprived of their needs on account of natural or man made disasters. It is the right of those deprived that these resources be restored to them. The wealthy man who;

"Continues to accumulate wealth and keeps his purse tied. " 70/18

Should know that;

"In their accumulated wealth, the ones who have been reduced to a state that they have to ask for fulfillment of their basic needs and those who have been deprived of their possessions, have a right that they can demand…" 70/24-25.

Notice that in the Quranic way of life, people reduced to a state of poverty, are not begging. It is, on the other hand, their right to live a decent life in economic security and

the well off are asked, in their own interest, to part with a part of their wealth to restore balance in society.

"Those who are niggardly and bid people to be niggardly and hide that which Allah has given them out of His grace, for them we have prepared an abasing chastisement…."4/37.

"And what harm would it do them if they believe in Allah and the day of reckoning and keep available part of the wealth given to them…" 4/39.

It would certainly do them no harm. On the other hand if they continue to excel with each other in accumulating wealth and denying it to those in need, they will live a miserable life.

"The race for excelling each other in accumulating wealth prevents you from determining the true aim in you life. Once in this mad race, you will continue in it till death. If you but halted a moment and deliberated about the consequences of this mad rush, you would surely realize that it is leading you towards disastrous results. It appears that rather than deliberating, you will continue with your mad race until you get to hell and then you will be asked why did you not keep available resources given to you which you kept hidden and unused for the good of humanity. (But then it will be too late)" 102/1-8.

The Prophet is asked to give them a timely warning.

"Eventual destruction and disaster is written for a person who keeps accumulating wealth and keeps counting it day and night in order to increase it. In stead of realizing this for himself, he keeps criticizing those who warn him of such consequences. In fact, he sometimes calls them bad names. He thinks that this accumulated wealth will last him till kingdom come. No. it is not like this at all. In fact, he is gradually drifting towards hell. And what is this hell. This is his greed for money which is like fire burning in his heart (which gradually consumes him)…" 104/1-7

Such, then are the dire consequences of not abiding by the solemn agreement with God in which man had pledged his belongings and, when necessary, his life, for creating a peaceful and prosperous world.

On the other hand, for those who abide by this agreement, a much more meaningful and prosperous life is assured.

"And as for the man, who gives from his own resources for growth of humanity and voluntarily goes on giving to restore balance to a society (rent by classes), this man travels through life and achieves his potential with ease…" 92/5-7

"The one who gives, when necessary, whatever he owns for the growth of humanity and does not consider that he is obliging the persons for whom he is giving and his giving is solely for compliance with the solemn agreement he contracted with his God, his noble effort will result in his total happiness." 92/18-21.

Prophet Muhammad (pbuh) is urged to do the same.

"O Prophet, look back on your own life. Were you not left helpless and alone and God provided you security? Were you not looking for guidance and God provided it to you through revelation? And were you not in need when God gave you so much that you were not dependent on anybody? So, now that you are in a position to help, do not turn away form a man who is left alone and helpless. If somebody is asking for help, do not leave him high and dry. God has provided you with resources. Keep them available to all." 93/6-11

History is witness to the fact that Prophet Muhammad (pbuh) did set up an economic system in which he demonstrably restrained himself from appropriating state resources to himself and his family. On the other hand, he set up a brilliant example by leading a hard and simple life himself so that he could divert State's resources towards those in need that is :

"Those who are left alone and helpless despite being amongst crowds of people" 90/15

And;

"Destitute who are reduced to dust so that they could earn only a meager living not enough for their basic reeds." 90/16.

A society based on such a just economic system prosper as long as it helps to extricate a large number of people and nations out of darkness.

****